بچوں کا پسندیدہ رسالہ
ماہنامہ
ساتھی
کراچی
مارچ ۲۰۱۶ء

نسلِ نو کا منفرد ادبی ترجمان
ماہنامہ
ساتھی
کراچی
بیک وقت دو زبانوں میں شائع ہونے والا واحد ماہنامہ
رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
چلد نمبر ۲۸ شمارہ نمبر ۳
مارچ ۲۰۱۶ء
قیمت ۳۰ روپے
مُدیر
فصیح اللہ حسینی
مجلسِ ادارت
محمد طارق خان
عبدالصمد بھٹی
عبدالرحمٰن المومن
شعبہ مارکیٹنگ
سیّد طلال علی
0333-2381277
اُسامہ شیخ
0336-2246181
شعبہ آئی ٹی
محمد یوسف منیر
سالانہ خریداری
رجسٹرڈ ڈاک 500 روپے
مشرقِ وسطیٰ 75 ریال
دیگر ممالک 35 ڈالر
ناشر: سرفراز احمد
نیک بنو نیکی پھیلاؤ
بزمِ ساتھی
رابطہ کیجیے
ایف 206، سلیم ایونیو، بلاک 13-B
گلشنِ اقبال، کراچی
پوسٹ بکس نمبر: 17982
فون نمبر: 34976468
اوقاتِ کار: شام ۵ تا رات ۱۰ بجے
monthlysathee@hotmail.com
satheecirculation@gmail.com
www.facebook.com/monthlysathee

دِل پہ دستک

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

کیا آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے کون سا دین پسند فرمایا ہے۔ جی آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن یہ بتائیے کہ اسلام میں ایسی کیا خاصیت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے ہمارے لیے پسند فرمایا؟ کیا کہا آپ نے؟ اسلام تمام مذاہب سے مختلف ہے اور اسلام ہی حقیقی معنوں میں دین ہے۔ ٹھیک ہے۔ دین کا مفہوم کیا ہے یہ بھی بتادیجیے۔ دین کے معنی جھکانے اور کنٹرول کرنے کے ہیں۔ اچھا تو ہم کہہ سکتے کہ دین مغلوب نہیں رہ سکتا دین غلبہ چاہتا ہے۔ آج سے ایک صدی پہلے ہندوستان میں دین اسلام پر عمل کرنے والوں کو اس کی کچھ عبادات اور رسوم کی اجازت تو تھی لیکن انھیں اسلام پر عمل پیرا نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔ اسلام مغلوب تھا اور ہندوستان کے حکمران اپنے کچھ درباری مسلمانوں کے ساتھ تو اچھا سلوک کرتے تھے لیکن مسلمانوں کی اکثریت کے ساتھ زیادتی کرتے تھے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک ایسا خطہ ملنا چاہیے جہاں وہ آزادی کے ساتھ اپنی زندگی اسلام کے اصولوں کے مطابق گزار سکے۔ اس خیال کے نتیجے میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو ہندوستان کے مسلمانوں نے مینارِ پاکستان لاہور میں جمع ہو کر ایک قرارداد پہ اتفاق کیا جسے ہم قراردادِ مقاصد کے نام سے جانتے ہیں۔

ساتھی چٹخارے

آپ کی تخلیق

السلام علیکم

کیا آپ کو معلوم ہے دنیا کا سب سے مشکل کام کیا ہے؟

اگر آپ وزیر اعظم ہوتے تو کہتے عوام کو مطمئن کرنا بہت مشکل کام ہے۔

اگر آپ وزیر ہوتے تو وزیر اعظم کی نگاہوں میں اپنا مقام پیدا کرنے کو مشکل کام گردانتے۔

اگر آپ صحافی ہوتے تو کہتے ایک چونکا دینے والی بڑی خبر تلاش کرنا سب سے مشکل کام ہے۔

یا پھر آپ کسی مضمون کے اُستاد ہوتے تو طلبہ کو سمجھانا آپ کو سب سے مشکل کام لگتا۔

اور طالب علم ہوتے تو امتحان کو دنیا کا سب سے مشکل کام کا درجہ دیتے۔

اگر مزدور ہوتے تو ٹھیکیدار سے پوری محنت کی کمائی کے حصول کو سب سے مشکل کام سمجھتے۔

زندگی کے تمام شعبوں میں ہر شخص اپنے اپنے مقام پر کسی نہ کسی چیز کو مشکل سمجھتا ہوگا۔ اسی طرح ہم جیسے بیچارے قسم کے مدیر حضرات کے لیے اداریہ تحریر کرنا سب سے مشکل کام ہے۔ مدیر بننے سے پہلے ہم بھی اپنی مصنوعی مونچھوں کو تاؤ دے کر سوچا کرتے تھے کہ اداریہ تو یوں چٹکی بجا کر لکھ لیں گے لیکن مدیر بننے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ہم نے شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالا ہے۔

اب آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ یہ لو یہ مدیر صاحب ایک اداریہ نہیں لکھ سکتے، ہم اگر مدیر ہوتے تو یوں دس بارہ اداریے لکھ مارتے۔

سوچنے پر کوئی پابندی نہیں...... آپ سوچیے ......اور ضرور سوچیے لیکن اداریہ لکھنے کے لیے مدیر بننا شرط ہے۔ اور جب مجلس ادارت کا انچارج سر پر کھڑا ہو کر کہے: 'مدیر بھیا! اداریہ؟'

پھر ہم آپ سے پوچھیں گے: 'سچ بتاؤ اب؟'

والسلام

آپ کا بھائی

فصیح اللہ حسینی

لڑاکو بہن

اعظم طارق کوہستانی

ازل سے چلی آرہی بھائی بہن کی گھریلو چشمک پر ہلکی پھلکی تحریر

اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک عدد بہن سے نوازتھا لیکن بہن ملی بھی تو کیسی، لڑاکو بہن۔ ہم نے اپنے محلے اور اسکول کے دوستوں میں ایسے لوگوں کو ڈھونڈا جو لڑاکو کے نام سے مشہور ہوں لیکن چند ایک جو نظر آئے وہ بھی ہماری لڑاکو بہن کے آگے پانی بھرتے نظر آئے۔

آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ ہم جیسا شریف اور معصوم شخص بھلا کیوں بہنوں کی توہین کر رہا ہے معذرت یہ توہین نہیں بلکہ حقائق سے پردہ اُٹھانے کی کوشش ہے، آپ ہماری روداد غم سنیں گے تو ہمارے ہمنوا ہو جائیں گے۔ ہمارے لیے جلسے جلوس نکالیں گے اور زیادہ گہرا اثر ہوا تو بعید نہیں کہ ایک عدد دھرنا اس قسم کی لڑاکو بہن کے خلاف دے جائیں۔ میں آپ کو چند واقعات سناتا ہوں جس کے بعد آپ ہی فیصلہ فرمائیں کہ حق پر کون ہے؟ بھائی یا بہن؟

ہوا یوں کہ ہماری زندگی کی وہ ایک خوشگوار صبح تھی۔ ہماری زندگی میں بے شمار خوبصورت صبحیں آئی ہیں لیکن پیاری بہن کی وجہ سے اس میں ہمیشہ نا کا اضافہ

ہو جاتا ہے۔اس طرح خوشگوار لیکن پھر ناخوشگوار دن کا آغاز...... آج ہمارا کرکٹ میچ تھا۔ جس میں ہماری شاندار بیٹنگ اور بولنگ کی بدولت ٹیم نے فتح حاصل کرلی۔ جذبات میں آ کر ہم نے سب دوستوں کی ملک شیک پارٹی کا انعقاد کیا۔ دوستوں کے ساتھ اپنے گھر جاتے ہوئے اچانک ہماری نظروں کے سامنے اپنی بہن کا سراپا لہرایا۔

''اُف! یہ میں نے کیا کردیا''۔ ہمارے جسم کا رُواں بھی پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔''بھاگ لو۔''

''کیا ہوا احمد رک کیوں گئے؟'' کپتان صاحب نے ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھا تو ہم ہوش کی دنیا میں لوٹ آئے۔

'' کچھ نہیں!'' ہم نے گڑ بڑا کر کہا اور آگے کی جانب قدم بڑھائے۔ کپتان نے پوری ٹیم کی طرف دیکھا۔ سب نے کندھے اُچکائے اور ہمارے پیچھے چل پڑے۔ آپ کو ایک راز کی بات بتاؤں، سچ بات یہ ہے کہ ہمیں زیادہ ڈر اس لیے لگ رہا تھا کہ ہم نے کل ہی ان کا دوپٹہ پیکو کروانے سے انکار کردیا تھا۔ وہ بے چاری مسلسل تین چار گھنٹوں سے میری منتیں کرتی رہیں لیکن اس وقت پاکستان کا میچ چل رہا تھا اس لیے ہم نے صاف انکار کردیا۔

وہ غصے میں کمرے سے چلی تو گئیں لیکن ان کے چہرے پر انتقام کی پرچھائیاں میں نے صاف دیکھ لی تھیں۔

دوستوں کو بیٹھک میں بٹھایا۔ امی ابو کے لیے ہاتھ سے ٹوپی بنانے میں مصروف تھیں۔ اس لیے اب لڑاکو بہن کی جانب ہی ہمارے قدم اُٹھنے تھے۔

''رفعت!'' ہم نے پوری کوشش کی کہ ہمارے لہجے میں دنیا جہان کی نرمی عود کر آئے جس میں کافی حد تک کامیابی بھی ملی۔

''کیا ہے''۔ انداز ایسا تھا کہ جی چاہا کہ......!

''وہ میرے کچھ دوست آئے ہیں''۔ ہم نے فوراً چائے بنانے کے بجائے ماحول بنانے کی کوشش کی۔

''میرے دوستوں کو مجھ پر رشک آتا ہے کہ میرے گھر والے بہت اچھے ہیں۔ ہم بہن بھائی لڑتے ہیں لیکن پیار ایسا ہے کہ 'مثالی بہن بھائی' کا ایوارڈ ہمیں ملنا چاہیے۔''

''اچھا......اور کیا کہتے ہیں''۔ لڑاکو بہن مطلب رفعت نے ''اچھا'' کو اتنا کھینچا کہ ہم سے الفاظ بھولنے لگے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ایسی نازک صورت حال میں ''اچھا'' کو کھینچنے کی بھلا کیا تک تھی۔

''اگر تم ٹھنڈے ٹھار ۱۲ عدد گلاس ملک شیک کے بنا دو۔ کیلے اور دودھ میں لے آیا ہوں''۔ میں فوراً تو نہیں لیکن گھوم پھر کر مدعے پر آ ہی گیا۔

''اچھا...... چلو میں بناتی ہوں۔ تم جاؤ دوستوں کے ساتھ گپ شپ لگاؤ''۔ ہمیں اس وقت حیرت کا زور

دار جھٹکا لگنے والا تھا۔ اگر ہم اپنے آپ پر قابو نہ رکھتے تو شاید لہرا کر گر پڑتے۔

''شاباش احمد! آخر بن ہی گئی بے وقوف''۔ ہم نے دل ہی دل میں کہا اور بیٹھک کی جانب بڑھ گئے۔

☆......☆

گھر میں خوب ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ ہم نے آسمان کو زمین سے ملانے کی کوشش کی لیکن امی کی صرف یہ بات کہ آخر غلطی انسان سے ہو ہی جاتی ہے۔

''غلطی ہو جاتی ہو گی امی جان! لیکن جو جان بوجھ کر کرے اسے غلطی نہیں کہا جا سکتا''۔ ہم نے خوب چبا چبا کر کہا۔

''خود اس دن دھنیے کی جگہ پودینا لے آئے تھے۔ وہ یاد نہیں۔ جب ہم نے کہا تو فوراً موصوف بولے، دھنیے اور پودینے کا معاملہ پیچیدہ ہے۔ انسان بھول جاتا ہے۔ غلطی سے ہو جاتا ہے۔'' رفعت نے ہماری نقل اتاری۔

''پرانی باتوں کو درمیان میں لانے کی کوئی تک نہیں بنتی''۔

''دو دن ہی ہوئے ہیں اس بات کو، ایسی بات ہے تو ہماری بات بھی ۳۰ منٹ پرانی ہو گئی ہے۔ ملک شیک میں چینی کے بجائے نمک کا استعمال ایک نیا آئیڈیا بھی تو ہے۔''

''آئیڈیے کی خالہ! میرے دوستوں میں میری کتنی بات خراب ہوئی۔ ناک کٹوادی میری تو'' میں تقریباً روہانسا ہو گیا۔

''اچھا! تو حضرت کی ایک عدد ناک بھی ہوتی ہے اور وہ کٹ بھی گئی۔ چچ چچ......'' رفعت نے افسوس کا اظہار کیا۔

''مجھے معلوم ہے تم نے پکو والے واقعے کا بدلہ لیا ہے۔ تمھارے دل میں اس دن سے انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی''۔

''چلو تمھیں اندازہ تو ہو گیا ناں کہ بہن سے لڑنا بہت مشکل کام ہے۔ تمھیں ہر کام کے لیے بالآخر وائٹ ہاؤس مطلب بہن سے رابطہ کرنا پڑتا ہے''۔

امی نے بیچ بچاؤ کرایا اور بولیں!'' احمد پہلی غلطی تو تمھاری ہے۔ تم بہن کے باہر کے کام نہیں کرو گے تو کون کرے گا''۔ اب امی رفعت کی طرف مڑیں۔

''تمھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بھائی کی بے عزتی کر کے کیا مزہ آتا ہے؟'' امی نے رفعت کی طرف دیکھا۔ جو میری طرف دیکھ کر مسلسل ہنسے جا رہی تھی۔ امی کی بھی ہنسی چھوٹ گئی۔ امی باہر نکلیں تو میں نے کشن اٹھایا۔ وہاں سے بھی کشن اٹھا لیا گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں کمرہ میدان جنگ کا منظر پیش کر رہا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی گھمسان کا رَن پڑا ہو۔

امتحان ہیں آئے بچو

نعیم الدین نعیم

امتحان ہیں آئے بچو ۔۔۔ جس نے ہوش اڑائے بچو
بچ کے کہاں کوئی جائے بچو ۔۔۔ خواب ڈراؤنے آئے بچو
کس تیزی سے سال ہے گزرا ۔۔۔ کیسے سمجھ میں آئے بچو
سردی میں آیا ہے پسینہ ۔۔۔ دل بھی بہت گھبرائے بچو
سب کو پڑی ہے اپنی اپنی ۔۔۔ کون کسے سمجھائے بچو
امی اور ابو بیٹھے ہیں ۔۔۔ تم سے آس لگائے بچو
سُستی کاہلی نے ہیں آخر ۔۔۔ دن یہ تمھیں دکھلائے بچو
محنت میں ہے عزت عظمت ۔۔۔ تم یہ سمجھ نہ پائے بچو
سوتے ہوئے سب سال گزارا ۔۔۔ نیند کسے اب آئے بچو
بن گئے سارے لوگ ہیں دشمن ۔۔۔ کون مدد کو آئے بچو
سر پر امتحان کھڑا ہے ۔۔۔ کرتا ہے دل ہائے بچو
لومڑی، بندر، شیر بنئے سب ۔۔۔ اللہ میاں کی گائے بچو
امتحاں کے بعد پوچھیں گے ۔۔۔ کتنے انڈے پائے بچو
اللہ نگہبان تمھارا ۔۔۔ ok بائے بائے بچو

ساتھ نعیم انکل کی دعا ہے
شاید کام آ جائے بچو

ڈھونڈو گے تو جانیں گے
ورنہ ہم نہ مانیں گے
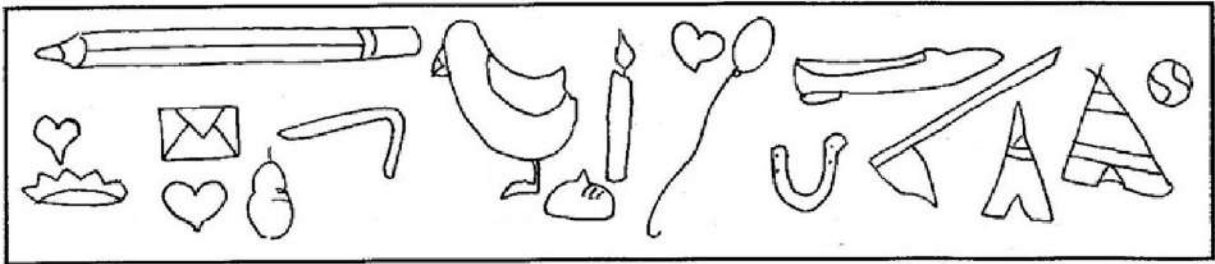
یہ کیسا عجیب لڑکا تھا جو اپنے امی ابو کو چھوڑ کر غلامی اختیار کرنے پر راضی تھا

انمول غلامی

عظمیٰ ابو نصر صدیقی

عکاظ کا میلہ اپنے عروج پر ہے۔ ہر قسم کا سامان تجارت یہاں موجود ہے اور لوگوں کا ایک جم غفیر اس بازار اور میلے سے لطف اندوز ہونے کے لیے یہاں جمع ہے انہی میں ایک حکیم بن حزام بھی موجود ہیں جنھیں ایک کم عمر نوجوان غلام پسند آ گیا ہے۔ آخر کار چار سو درہم پر معاملہ طے ہو گیا اور وہ اس بچے کو اپنے ساتھ مکہ لے آئے اور پھر اپنی پھوپھی خدیجہ رضی اللہ عنہا کو بطور تحفہ پیش کر دیا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لڑکے کو دیکھا جس کے چہرے پر دیانت، ذہانت اور شرافت چمک رہی تھی تو آپؐ نے زید رضی اللہ عنہ کو خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اپنے لیے مانگ لیا۔

نوجوان زید کو پندرہ سال کی عمر میں ایک ایسی ہستی کی غلامی ملی کہ جس کے اخلاق و کردار کی گواہی زمین و آسمان کے خالق نے خود دی ہے۔

زید اپنے پیارے آقا کے ساتھ بہت خوش تھا کہ

اچانک اسے اپنے والد اور چچا کی آمد کی اطلاع ملتی ہے۔" اپنے والدین کا نہایت لاڈلا بیٹا جس کی تلاش میں انھوں نے ہر جگہ چھان ماری تھی آج ایک غلامانہ زندگی بسر کر رہا ہے۔ والدین اسے ہر قیمت پر اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئے تھے۔

کئی برس سے بچھڑا ہوا باپ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور روتے ہوئے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے بیٹے زید کی آزادی کی درخواست کرنے لگا، جس کی آزادی کے لیے وہ اپنی تمام مال و متاع دینے کے لیے تیار تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غمزدہ باپ کو تسلی دی اور فرمایا: "جو زید پسند کرے گا وہ مجھے بھی منظور ہے اگر وہ اپنی خوشی سے آپ کے ساتھ جانا چاہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، میں اس کے لیے آپ سے کوئی فدیہ نہیں لوں گا لیکن اگر وہ میرے ساتھ رہنا چاہے تو میں ایسا نہیں ہوں کہ اس کے ساتھ زبردستی کروں۔" نبیؐ کے اس فیصلے سے زید کے والد حارثہ اور چچا بہت خوش ہوئے کہ بھلا بیٹا کیوں انکار کرے گا؟ زید کو دیکھ کر ان کے والد بے اختیار ان کو سینے سے لگا کر رونے لگے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "زید دیکھو یہ دو مہمان آئے ہیں کیا تم انھیں پہچانتے ہو؟" زید نے کہا: "جی یہ میرے والد اور چچا ہیں۔"

آپؐ نے فرمایا: "میری طرف سے تمھیں اجازت ہے اگر ساتھ جانا چاہو تو جا سکتے ہو اور اگر میرے ساتھ رہنا چاہو تو رہ سکتے ہو۔"

زید فوراً آپؐ سے لپٹ گئے اور کہا: "میرے آقا میں آپ کی ذات پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا میں تو آپ کے ساتھ ہی رہوں گا۔"

زید کا یہ جواب سن کر ان کے والد حیران رہ گئے اور زید سے کہا: "زید تم پر افسوس ہے تم اپنے حقیقی رشتوں، قوم، وطن اور آزادی پر ایک غلامی کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔"

زید بولے: "والد محترم میرے آقا مجھ پر اتنے مہربان ہیں کہ حقیقی والدین بھی اپنی اولاد پر اتنا رحم و شفقت نہ کرتے ہوں گے میں انھیں کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔"

حضرت زید کا جواب سن کر نبی کریمؐ بہت زیادہ خوش ہوئے آپ نے اسی وقت انھیں آزاد کر دیا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر خانہ کعبہ لے گئے اور لوگوں کے مجمع میں یہ اعلان کیا کہ لوگو! گواہ رہنا، زید آج سے آزاد ہے اور میرا بیٹا ہے یہ میرا اور میں اس کا وارث ہوں۔

جب والد اور چچا نے اپنی آنکھوں سے محمدؐ کا زید رضی اللہ عنہ سے برتاؤ دیکھا تو خوشی خوشی واپس چلے گئے اور اس دن کے بعد سے لوگ زید کو زید بن محمدؐ کہنے لگے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب نبی بنائے گئے تو زید نے بلا تاخیر اسلام قبول کیا اور سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں شامل ہو گئے۔

نبی کریمؐ حضرت زید کو حقیقی بیٹوں کی طرح ہی چاہتے تھے اور اکثر انھیں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ تبلیغ اسلام کے لیے اکثر قبائل میں جاتے وقت حضرت زید رضی اللہ عنہ نبی کریمؐ کے ہمراہ ہی ہوتے تھے۔ طائف کی وادی میں گزرے سخت ترین ایام میں بھی نبی کریمؐ کے ساتھ پتھر کھانے والوں میں حضرت زید رضی اللہ عنہ بھی تھے جنھوں نے باغ میں پناہ لینے کے بعد نبی کریمؐ کے زخموں کو اپنی چادر سے صاف کیا۔ مدینہ ہجرت کے بعد مواخاۃ میں حضرت زید رضی اللہ عنہ کو حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ مشہور انصاری صحابی کا ساتھی بنایا گیا۔ حضرت زید واحد صحابی ہیں جن کا نام قرآن مجید میں موجود ہے، قرآنی احکام کے مطابق اس بات کی ممانعت کر دی گئی کہ کوئی منہ بولے بیٹے کے ساتھ اپنا نام نہیں لگا سکتا بلکہ حقیقی والد کا ہی نام لگایا جائے گا۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ ایک بہترین سپہ سالار تھے اور ہر وقت جہاد کے لیے تیار رہتے تھے۔ نبی کریمؐ کے ساتھ مشہور غزوات کے علاوہ بھی ان کو بہت سی فوجی مہمات پر بھیجا گیا جن میں وہ کامیاب ہوئے۔

غزوہ موتہ کے موقع پر نبی کریمؐ نے ایک سفیر کے قتل کیے جانے پر انتقام لینے کے لیے تین ہزار مجاہدین کا لشکر روانہ کیا اور اس لشکر کا امیر حضرت زید رضی اللہ عنہ بن حارثہ کو بنا کر کہا کہ اگر زید رضی اللہ عنہ شہید ہو جائیں تو جعفر رضی اللہ عنہ بن ابی طالب امیر لشکر ہوں گے اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ قیادت سنبھالیں گے۔

بالآخر عیسائیوں کے ایک لاکھ کے لگ بھگ کے لشکر سے یہ اللہ کے سپاہی اللہ کے بھروسے پر لڑ پڑے، نہایت بہادری سے لڑتے حضرت زید رضی اللہ عنہ لشکر اسلام کا علم سنبھالے اپنے ساتھیوں کو جوش دلانے کے لیے دشمن کی صفوں میں گھستے چلے گئے اور لاتعداد منکرین اسلام کو واصل جہنم کیا آخر کار ان کے سینے میں ایک نیزہ لگا اور وہ شہید ہو کر نیچے گر گئے۔ اس کے بعد بالاترتیب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت عبداللہ بن رواحہ نے علم سنبھالا اور شہید ہو گئے آخر کار حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن ولید نے علم سنبھالا اور گھمسان کی جنگ کے بعد کامیاب و کامران ہو کر واپس لوٹے۔

نبی کریمؐ حضرت زید رضی اللہ عنہ سے اتنی محبت کرتے تھے کہ وہ مدینے میں حب رسول اللہ کے لقب سے مشہور تھے آپ کے مرتبے پر صحابہ کرام بھی رشک کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو۔

یہ بربریت کیا ہے؟

اطہر علی ہاشمی

مدیرِ اعلیٰ روزنامہ جسارت

مدیران ساتھی کی محنت اور ژرف نگاہی (مطلب لغت میں دیکھیں، ہمیں اچھا لگا سو لکھ دیا) ہمارا کام دشوار تر کر دیتی ہے۔ یونہی یاد آ گیا کہ بہت سے لوگ ''سب سے بہترین، سب سے خراب ترین یا سب سے دشوار ترین لکھ دیتے ہیں۔ اس سے جملہ زور دار ہو جاتا ہے۔ لیکن بہترین، بدترین وغیرہ کا تو مطلب ہی یہ ہے ''سب سے بہتر یا سب سے بدتر''۔ اب صورت حال یہ ہے کہ مزے مزے کی کہانیوں سے لطف اندوز ہونے کے بجائے ہم خامیاں اور غلطیاں ڈھونڈنے میں لگ جاتے ہیں۔ اور ہاں! ''کی بجائے'' کی جگہ ''کے بجائے'' صحیح ہے۔

ساتھی کی طرف سے لکھنے والوں/روالیوں کے لیے ایک کارگہہ (ورک شاپ) میں ایک بچی بتا رہی تھی کہ اس کی تحریر مختصر ہو جاتی ہے۔ اپنی بات اختصار کے ساتھ کہنا تو کمال ہے۔ ہم خود یہ کمال حاصل نہیں کر سکے لیکن جب کوئی رسالہ، کتاب ہاتھ لگتی ہے تو مختصر تحریروں کو پہلے پڑھتے ہیں۔ جنوری 2016ء کے ساتھی میں بھی سب سے پہلے لطیفے اور پھر ''گوشے'' پڑھے۔ البتہ یہ اب تک سمجھ میں نہیں آیا کہ باز کا شکار پرندے تو ہوتے ہیں مگر وہ کون سے ''چھوٹے چھوٹے دودھ پلانے والے جانور ہیں جو باز کے شکاروں میں شامل ہیں۔ چمگادڑ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ انڈے بھی دیتی ہے اور دودھ بھی پلاتی ہے (اپنے ہی بچوں کو) مگر اس کا شکار باز کو پسند نہیں اور ہاں! میر شکار باز کو سدھاتا نہیں بلکہ رؤسا کے لیے شکار کا بندوبست کرتا تھا۔ امید ہے سلمان احمد ایسے دودھ پلانے والے جانوروں کا تعارف کرائیں گے۔

چلیے! اب دل پر دستک دیتے ہیں۔ حسب معمول

خوب ہے۔ علامہ کے شعر کے پہلے مصرع میں ''اسی قرآن میں'' سہواً نکتہ رہ گیا ہے یعنی یہاں ''قرآں'' ہے۔ اسی میں ایک جملہ ہے ''ہمیں ہمارے والدین اس قرآن مجید کی تعلیم ہمیں عطا کرتے ہیں۔'' ہمیں کی تکرار نہیں ہونی چاہیے تھی لیکن ''تعلیم عطا کرتے ہیں'' کی جگہ تعلیم دلواتے ہیں، ہوتا تو اچھا تھا۔ اسی دستک میں بہت اچھی مثال دی گئی ہے کہ ''ڈاکٹر ایک پرچے پر دوا لکھ کر دے کہ اس کو خرید کر کھالو'' اور آپ دوا کا نام بار بار پڑھنا شروع کر دیں تو کیا صحت مل جائے گی۔ لیکن ڈاکٹر کی تاکید تو یہ ہے کہ خرید کر کھالو۔ بات بنی نہیں۔ لکھنا یہ چاہیے تھا کہ ڈاکٹر نے دوا لکھ کر دیدی۔ اس نسخے کو اپنے پاس رکھنے سے شفا نہیں ہوگی۔

سیما صدیقی ایک بار پھر دلچسپ اور سبق آموز کہانی لے کر آئی ہیں۔ ''ہو رہے گا کچھ نہ کچھ'' میں باتوں باتوں میں اقبالؒ کا یہ مشورہ منثور (نثر میں) کر دیا ہے کہ ''ستارا کیا مری تقدیر کی خبر دے گا''۔ یہ کہانی پڑھ کر ہم نے بھی، آج کا دن کیسا گزرے گا'' کا کالم پڑھنا چھوڑ دیا جو ہم دن گزرنے بلکہ اگلا دن شروع ہونے پر پڑھ لیتے ہیں۔ ''کنفیوز'' کی جگہ ''الجھن میں'' لکھنے میں کوئی کنفیوزن نہیں ہونا چاہیے۔ ''ناراضگی'' (صفحہ 14) کی جگہ ناراضی سے کام چل سکتا ہے۔ ورنہ ''راضگی'' بھی لکھا جائے جیسے راضی لکھا اور کہا جاتا ہے۔ ''والٹ'' (صفحہ 15) اتنا عام ہو گیا ہے کہ اب بٹوہ کہنا پس ماندگی کی علامت بن گیا۔ پرس بھی انگریزی کا لفظ ہے لیکن والٹ سے کم وزنی ہے۔ شاید پرس صرف خواتین سے مخصوص ہو گیا ہے اور بٹوہ کسی بزرگ خاتون کے لیے جو اس میں پان، چھالیہ رکھتی ہیں۔ ''پیشن گوئیوں'' (صفحہ 16) کی جگہ یا تو پیش گوئیوں لکھا جائے یا ''پیشین گوئیوں''۔ پتہ کے بارے میں شاید پہلے بھی لکھا تھا کہ تینوں ''پتے'' پتّا (درخت کا) پتا (گھر کا) اور پِتّا (جسم کا عضو) تینوں کے آخر میں الف ہے۔ ''پتّا ہونا'' غائب ہو جانا، ہوا ہو جانا کے معنوں میں بھی آتا ہے۔

عالم اسلام کی شاہکار مساجد کا سلسلہ بہت معلوماتی اور دلچسپ ہے۔ اس بار ''شیخ زید مسجد، متحدہ عرب امارات'' کا تعارف دیا گیا ہے۔ لیکن یہ شیخ زاید مسجد ہے اور امارات کے پہلے صدر کا نام بھی زید نہیں زاید تھا۔ لیکن اردو میں چونکہ زاید یا زائد فالتو کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اس لیے شیخ صاحب کو زاید نہیں لکھا جاتا۔ شیخ صاحب زاید ہی ہیں۔ کراچی میں یونیورسٹی روڈ سے کبھی گزر ہو تو شیخ زاید یونیورسٹی پر بڑا بڑا ''زاید'' لکھا ہوا دیکھا جا سکتا ہے۔ شیوخ کو زاید ہونے پر کوئی اعتراض نہیں ویسے نوزایدہ (یا زائدہ) تو سنا ہی ہوگا، دیکھا بھی ہوگا۔ اس زایدہ کا مادہ (روٹ) بھی ایک ہی ہے۔

غلام مصطفیٰ سولنگی پھر معلومات کا خزانہ لائے ہیں۔ سندھ کے شہر شہداد کوٹ میں ''شان دار اور حیران کن'' سیرت لائبریری کا احوال پڑھ کر جی چاہا کہ ہم بھی جا کر دیکھیں اور یہ افسوس بھی ہوا کہ ایسی نادر چیزیں چھپی ہوئی کیوں ہیں۔ کراچی والوں کا یہ عالم ہے کہ سندھ میں رہتے ہیں مگر سندھ سے دور۔

لطیفوں پر کوئی تبصرہ نہیں کریں گے۔ بہت سے بچوں کے لیے نئے ہوں گے اور نئے لطیفے آئیں گے بھی کہاں سے۔ انوشہ سروپ ''ٹوتھ پیسٹ'' لے کر آئی ہیں لیکن یہ طے نہیں کرسکیں کہ یہ مذکر ہے یا مونث۔ ایک ہی کہانی میں دونوں مل جائیں گے، اب جسے جو پسند ہو۔ چھٹکارہ (صفحہ 35) خواہ کسی جن سے حاصل کرنا ہو 'ہ' کی جگہ الف استعمال کیا جائے۔ یعنی ''چھٹکارا''۔

''ایک اور بچوں کے مقبول شاعر'' (صفحہ 46) یہاں بھی وہی عیب ہے یعنی الفاظ درست جگہ پر نہیں۔ عبد الرحمٰن المومن اگر یوں لکھتے تو کیا ہرج تھا۔ ''بچوں کے ایک اور مقبول شاعر'' احمد حاطب ہر چند کہ صاحب ہیں لیکن شاید کمپوزر کی مہربانی نے انہیں حاطب سے صاحب بنا دیا۔ (صفحہ 47)

عبدالصمد بھٹی (صفحہ 57) نے ساتھی رائٹرز ایوارڈ کی دلچسپ رپوٹ پیش کی ہے کیوں کہ اس میں ہمارا نام بھی تھا۔ ہمیں اعلیٰ کی جگہ اعلا سے اتفاق نہیں۔ یہ بحث بعد میں لیکن اس رپورٹ کا پہلا جملہ ہی مزے کا ہے۔ بھٹی صاحب اپنے حادثے کا احوال یوں بیان کرتے ہیں ''لنگڑاتے پاؤں اور لڑکھڑاتے قدموں''۔ اللہ ان کو صحت کاملہ عطا کرے لیکن یہ ''لنگڑاتے پاؤں'' کیا ہوتا ہے؟ کیا ہاتھ بھی لنگڑاتے ہیں؟ اور جب لنگڑا ہی رہے تھے تو لڑکھڑاتے قدموں کے اضافے کی کیا ضرورت تھی یا لنگڑاتے اور لڑکھڑاتے یا صرف لنگڑاتے ہوئے لکھتے تو بھی یہ بات سمجھ میں آجاتی کہ حادثے کا شکار ہوئے ہیں۔ ممکن ہے یہ سہو بھی حادثے کا نتیجہ ہو۔

رمشا جاوید کی کلی مہک رہی ہے۔ لیکن کیا کے ای ایس سی (صفحہ 67) اب بھی وجود رکھتی ہے؟ عبدالصمد بھٹی نے یوسف بن تاشفین کا تعارف کرایا ہے۔ ساتھیوں کو مسلمانوں کی تاریخ سے روشناس کرانے کے لیے ''تاریخ کی کھوج'' بھی اچھا سلسلہ ہے۔ یوسف بن تاشفین میں شروع میں لکھا ہے کہ الفانسو کی مجموعی فوج ایک لاکھ 20 ہزار تھی۔ شکست کے بعد یہ صرف 60 ہزار رہ گئی (صفحہ 76) یوسف بن تاشفین کی فوج ہو یا طارق بن زیاد فاتح اندلس کی فوج۔ اس میں بربر مسلمان شریک تھے اور طارق بن زیاد خود بھی بربر تھا۔ پورے یورپ کی افواج کی بدترین شکست کے بعد مسلمانوں کو بربر کہا جانے لگا اور ان کے بارے میں خوف ناک افواہیں پھیلائی گئیں کہ وہ

انسانوں کو کھا جاتے ہیں اور انتہائی وحشی ہیں۔
مسلمانوں سے متنفر کرنے کے لیے یورپ کے پادریوں نے ”بربرازم“ کی اصطلاح گھڑلی اور ہم بھی ان کی پیروی میں خوشی خوشی ”بربریت“ کی اصطلاح استعمال کر کے انہیں خوش کرتے ہیں۔
نورین ایمان کا شرارتی بھوت دلچسپ ہے۔ لیکن مدیران ساتھی طے کرلیں کہ منہدی میں رنگ کیسے آئے گا، ہ سے پہلے ن یا نون کے بعد ہ، یعنی مہندی۔ کہانی میں دونوں اختیارات دے دیے ہیں اور ایک ہی صفحہ پر (87) اور ہاں بی بی! یہ سینک کیا ہوتا ہے ہم نے تو سنا تھا کہ جھاڑو کے تنکے کو کہتے ہیں یا چوٹیں سینکی جاتی ہیں، دھوپ بھی سینکی جاتی ہے۔ گمان ہے کہ یہ انگریزی کا لفظ سنک (Sink) ہے جو خود بھی ڈوب گیا۔ ”دھاگا“ کے بارے میں شاید پہلے بھی لکھا جا چکا ہے۔ لیکن ایک ہی صفحے (88) پر دو طرح کے دھاگے، یعنی دھاگہ اور دھاگا۔ ممکن ہے لمبے دھاگے کو دھاگا کہا جاتا ہو۔ ایک محاورے ”کوا چلا ہنس کی چال“ کو دلچسپ انداز میں کہانی کا روپ دیا گیا ہے۔
البتہ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ نیم کا تنا کتنا موٹا تھا کہ اس کے اندر ایک کمرا بن گیا۔ پہاڑوں کے دامن میں نیم کا درخت ہوتا تو نہیں کہ یہ میدانی درخت ہے۔ ممکن ہے پہاڑی علاقے کا نیم ایسا ہوتا ہو کہ اس کے تنے میں کمرا بن جائے۔ درخت پر لکڑی کا گھر بنا لیا جاتا تو قرین قیاس ہوتا (ٹری ہاؤس)
قصہ پانچ روپے کا بھی اچھی کہانی ہے۔ بس ناطے کی جگہ ناتے ہوتا تو اچھا تھا۔ زاہدہ عروج تاج نے مشورہ دیا ہے کہ (صفائی کے لیے) اخبارات وغیرہ ایک جگہ جمع کر کے جلا دو۔ ہم تو اس بات پر نہیں مسکرائے لیکن کیا کاغذ کے دھویں سے آلودگی میں اضافہ نہیں ہوگا۔ پھر یہ کہ اخبارات اور ”وغیرہ“ میں ممکن ہے قرآنی آیات واحادیث ہوں جو عموماً ہوتی ہیں۔ کسی نے دیکھ لیا تو ہنگامہ کردے گا۔ اور ہاں! شعر استعمال کریں تو سوچ سمجھ کر ورنہ دوسرے بھی غلط شعر یاد کرلیں گے۔
یہ شعر صحیح نہیں۔
میں تنہا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا
مدیران ساتھی یہ شعر صحیح کریں۔ اسماء سید کی عیدی سبق آموز ہے۔ بس ذرا علاوہ اور سوا کا فرق ابھی سے ملحوظ رکھیں ورنہ عادت پکی ہو جائے گی۔ علاوہ کا مطلب ہے 'مزید'، انگریزی میں More over۔ (صفحہ 106) زین کے علاوہ کی جگہ زین کے سوا ہونا چاہیے تھا۔
ایک دلچسپ سبق (92) مزے کا ہے لیکن کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم جو کوشش کرتے ہیں، کچھ بچے اسے بھی جھٹک دیتے ہوں۔

☆......☆

ساتھی مُصوّری

سید محمد اُسید انعام
نورین ایمان
ارفع تسلیم
ناہید ضمیر حسین
طوبیٰ عبدالرؤف قریشی
سید حمزہ انعام
شہنیلا سہیل

سب سے بڑا پرندہ

محمد علی ادیب

شتر مرغ دنیا کا سب سے بڑا پرندہ ہے جو صرف براعظم افریقا کے ممالک میں پایا جاتا ہے۔ شتر مرغ دنیا کا وہ واحد پرندہ ہے جو اُونٹ جتنا بڑا ہوتا ہے۔ یہ ہمیشہ غول کی صورت میں رہتے ہیں۔ غول کا ایک سردار ہوتا ہے۔ جس کی رہنمائی میں غذا تلاش کرتے ہیں۔

خاندان:

شتر مرغ کا تعلق پرندوں کے اُس خاندان سے ہے جو اُڑ نہیں سکتے۔ شتر مرغ کے خاندان میں کیوی، ایمو، ریا اور کیسوری قابلِ ذکر ہیں۔

اقسام:

چار قسم کے شتر مرغ بہت مشہور ہیں۔

۱۔ جنوبی شتر مرغ ۲۔ مسائی شتر مرغ ۳۔ سرخ گردن والا شتر مرغ ۴۔ صومالی شتر مرغ

جنوبی شتر مرغ صرف جنوبی افریقا کے ممالک میں ملتی ہے۔ اس کے پَر بہت گھنے اور سیاہ ہوتے ہیں۔ مقامی لوگ اسے پَروں کی وجہ سے ہی شوق سے پالتے ہیں۔

مسائی شتر مرغ افریقی ممالک، کینیا، تنزانیہ، ایتھوپیا اور صومالیہ میں ملتی ہے۔ اس کے سر پر چھوٹے چھوٹے پَر ہوتے ہیں۔

سرخ گردن والا شتر مرغ کو شمالی افریقی شتر مرغ بھی کہتے ہیں۔ تمام اقسام میں اس کی لمبائی سب سے زیادہ ہے۔ سرخ گردن اس کی خاص پہچان ہے۔ نر کے پَر سیاہ اور مادہ کے سرمئی ہوتے ہیں۔

جسم

شتر مرغ اُونٹ کی طرح لمبا چوڑا، مضبوط، لمبی ٹانگوں، سخت چونچ اور لمبی گردن والا دنیا کا سب سے بڑا پرندہ ہے۔ شتر مرغ اپنی لمبی ٹانگوں کی مدد سے ۷۰ کلو میٹر فی گھنٹے کی رفتار سے بھاگ سکتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ دنیا کا تیز ترین پرندہ بھی ہے۔

قد، عمر، وزن:

شتر مرغ کا اوسط وزن ۷۵ تا ۱۰۰ کلو گرام جبکہ قد ۷ فٹ تک ہوتا ہے۔ تاہم ۱۶۰ کلو گرام سے زیادہ وزنی اور ۱۰ فٹ سے اُونچے شتر مرغ بھی دیکھے گئے ہیں۔ شتر مرغ کی اوسط عمر ۴۵ سال ہے۔

آواز:

شتر مرغ بہت کم آواز نکالتا ہے۔ خطرے کے وقت وہ شیر کی طرح غُراتا ہے۔ عام حالات میں اس کی آواز تیز سیٹی جیسی ہوتی ہے۔

انڈا:

شتر مرغ کا انڈا دنیا کے سارے پرندوں کے انڈوں سے بڑا ہے۔ اس کے انڈے میں مرغی کے ۲۵ انڈے آ سکتے ہیں۔ ۶ انچ چوڑے اور ۱۵ انچ لمبے اس انڈے کا وزن ڈھائی کلو گرام تک ہوتا ہے۔ مادہ شتر مرغ جھاڑیوں یا کسی کھوہ میں ۱۵ سے ۲۰ تک انڈے دیتی ہے۔ تقریباً ۴۰ دن کے بعد انڈوں سے بچے نکل آتے ہیں۔

چچا ہادی نے جاسوسی کی

جاوید بسام

ایک دو گھروں سے ہی مجھے گوشت کی خوشبو آئی۔ میں نے آ کر چچا کو بتایا وہ شرلاک ہومز کی طرح گردن ہلاتے ہوئے بولے......

ایک دن جب میں چچا ہادی کے پاس گیا تو دیکھا ان کے کمرے کی دیواروں پر بڑی بڑی

تصویریں لگی ہیں۔ جن پر انسانی ہاتھ اور ہاتھوں کی آڑی ترچھی لکیریں بنی تھیں۔ میز پر چند پرانی بوسیدہ کتابیں بھی رکھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر چچا چہک کر بولے۔ ''آؤ میاں عامر! میں تمھارا ہی انتظار کر رہا تھا۔''

''یہ کیا ہے؟'' میں نے تصویروں کی طرف اشارہ کیا۔

بولے: ''ایک پامسٹ اپنا کاروبار ختم کر رہا تھا میں نے اس سے یہ سامان خرید لیا ہے۔ تمھیں پتا ہے مجھے پامسٹری سے بہت دلچسپی ہے۔ آج سے ہم یہ کام شروع کر رہے ہیں۔'' میں نے گہری سانس لی۔

وہ بولے: ''سائن بورڈ بنوانے کو دے رکھا ہے بس وہ لاتا ہی ہوگا۔''

اتنی دیر میں ایک آدمی بڑا سا بورڈ اٹھائے آتا نظر آیا۔

''لو وہ آ گیا۔'' چچا جوش سے بولے۔
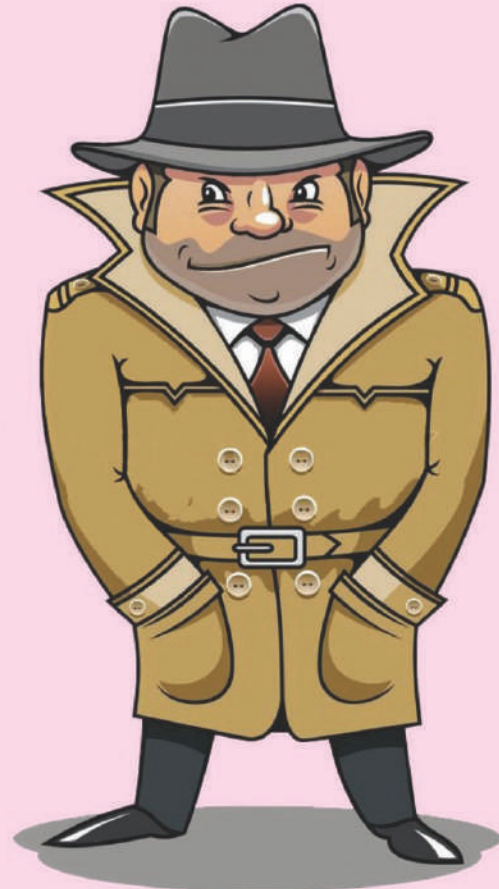
ہم باہر آ گئے۔ بورڈ پر جلی حرف میں پروفیسر چچا ہادی لکھا تھا، آگے ڈھیروں اسناد بھی درج تھیں۔ جب بورڈ لگ گیا تو ہم اندر آ گئے۔ چچا بولے: ''بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا۔''

''میرا خیال ہے مسئلہ تو اب پیدا ہوا ہے۔ یہ اسناد آپ نے کس یونیورسٹی سے لی ہیں؟'' میں نے کہا۔

چچا مسکرا کر بولے: ''میاں پریشان نہ ہو۔ یہ اسناد میں نے آن لائن لی ہیں اور آج سے اپنے کام کی فکر کرنا بھی چھوڑ دو ہم یہ کاروبار شروع کر رہے ہیں۔'' وہ اس طرح بولے جیسے کوئی فیکٹری شروع کرنے کی نوید سنا رہے ہوں۔

''مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''تم میرے اسسٹنٹ ہو۔ آج سے تمھاری نوکری شروع ہو گئی ہے۔''

''میری تنخواہ کیا مقرر ہوئی ہے؟'' میں نے سوال داغا۔

یہ سن کر وہ گڑبڑا گئے پھر سنبھل کر بولے: ''پانچ سو روپے۔''

''یومیہ؟''

''نہیں میاں ماہانہ۔'' وہ شوخی سے بولے۔

''ٹھیک ہے لائیں دو مہینے کی تنخواہ ایڈوانس دے دیں مجھے نئی پتلونیں خریدنی ہیں۔'' میں نے چالاکی سے کہا۔

چچا کھسیانی ہنسی ہنسے اور بولے: ''میاں ہماری دوستی میں پیسے جیسی بے وفا چیز کو بیچ میں مت لاؤ، دیکھنا کچھ دنوں میں یہاں لوگوں کی قطاریں لگی ہوں گی۔ ہمارے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔''

''آپ کو یقین ہے کہ لوگ یہاں آئیں گے؟''

''کیوں نہیں زیادہ تر لوگ ضعیف الاعتقاد ہیں، ہر کوئی درمیانی راستے کی تلاش میں ہے۔''

''پھر کیا خیال ہے اس بورڈ پر چند اور چیزوں کا اضافہ نہ کر دیں مثلاً استخارہ، ہر کام منٹوں میں وغیرہ۔'' میں نے طنزاً کہا۔

''آئیڈیا برا نہیں ہے۔'' وہ مسکرا کر بولے۔

میں نے زور سے لاحول پڑھی۔

اتنی دیر میں ہم نے ایک ٹین ڈبے والے کو دیکھا جو غور سے بورڈ پڑھ رہا تھا۔ چچا نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ جھجکتے ہوئے اندر چلا آیا اور سلام کیا۔ چچا نے تپاک سے اور میں نے زیرِ لب جواب دیا۔ چچا نے اسے اپنے سامنے والی کرسی پیش کی۔ وہ اس کا باغور جائزہ لے رہے تھے۔

ٹین ڈبے والا بولا: ''پروفیسر صاحب آپ کی فیس کتنی ہے؟''

''پچاس روپے ایک ہاتھ کے۔'' چچا جلدی سے بولے۔

''میں نے منہدی نہیں لگوانی اپنے مستقبل کا حال

معلوم کرنا ہے۔'' وہ بولا۔

چچا نے اسے گھورا اور ہاتھ آگے کرنے کا حکم دیا، لیکن وہ بولا کہ میں غریب آدمی ہوں بیس روپے دوں گا۔

چچا نے کچھ دیر سوچا پھر بولے۔

''چلو ٹھیک ہے'' اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میں نے دیکھا اس کے ہاتھوں کی اکثر لکیریں غائب تھیں۔ چچا ہاتھ پکڑے سوچ میں گم تھے پھر بڑبڑانے لگے اور بولے: ''میاں تمھارا سیارہ مشتری ہے اور ان دنوں مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔''

وہ بولا: ''ان دنوں کیا، میں نے تو ہمیشہ خود کو مشکلات میں ہی پایا ہے۔''

چچا سر ہلانے لگے: ''یہ بتائیں کیا کبھی میں اپنی ذاتی دکان اور گھر لے پاؤں گا؟''

چچا غور سے ہاتھ دیکھتے رہے پھر بولے: ''پانچ سال تک تو مشکل ہے اس کے بعد کچھ تبدیلی آ سکتی ہے۔''

آدمی نے مسکرا کر پوچھا: ''میری شادی کب ہوگی؟''

''مجھے نہیں لگتا اب تمھاری شادی ہوگی کیونکہ شادی کی لکیر لوہا پیٹتے پیٹتے مٹ چکی ہے۔''

آدمی کے منھ سے بے ساختہ ہنسی نکل گئی۔ مجھے گڑبڑ محسوس ہوئی، لیکن چچا اپنی باتوں میں لگے تھے۔ آدمی خوب قہقہے لگا رہا تھا۔ پھر اس نے ہاتھ چھڑایا اور ادب سے بولا: ''پروفیسر چچا! آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں چھ بچوں کا باپ ہوں۔ میرے پاس اپنی ذاتی دکان اور مکان بھی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

چچا نے بڑھ کر فوراً اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اعتماد سے بولے: ''میاں ستاروں کا حساب ہے کبھی غلط بھی ہو جاتا ہے۔ لاؤ فیس نکالو۔''

''کس بات کی فیس؟''

''ہاتھ دیکھنے کی۔'' چچا غضب ناک لہجے میں بولے۔ ''ورنہ دوبارہ اس گلی میں نہیں آنے دوں گا۔''

آدمی کو پیسے دینے ہی پڑے۔ اس نے ٹیبل پر بیس روپے رکھے اور باہر نکل گیا۔ چچا مجھ سے نظریں چرا رہے تھے اور میں اپنی نظروں میں خود اتنا گر چکا تھا کہ سوچ رہا تھا کہ ملازمت کے لیے فوراً ہی استعفا دے

دماغ کا آپریشن

اسپتال کا سارا عملہ ایک شخص کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ کسی نے پوچھا: ''کیا ہوا، تم لوگ اس شخص کے پیچھے کیوں بھاگ رہے ہو؟''

اسپتال کے ایک ملازم نے کہا: ''یہ شخص جو سب سے آگے بھاگ رہا ہے چوتھی بار دماغ کا آپریشن کروانے آیا ہے اور ہر بار بال کٹوا کر بھاگ جاتا ہے۔''

مرسلہ: خبیب احمد، کراچی

کر گھر چلا جاؤں کہ چچا ہادی نے صورتحال کو سنبھالا اور بولے: ''میاں دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں۔
''گرتے ہیں شہ سوار ہی میدان جنگ میں''
ایسا بھی ہوتا ہے بہرحال گرمی ہو رہی ہے تو ذرا نکڑ سے چند لیموں اور برف لے آؤ۔ شربت بنا کر پیتے ہیں۔''
دل تو چاہ رہا تھا کہ چچا کو کھری کھری سناؤں، لیکن بڑوں کا احترام آڑے آیا۔ میں نے پیسے اُٹھائے اور غصے میں باہر نکل گیا۔ شربت پی کر فارغ ہوئے تو طبیعت کچھ معمول پر آئی۔ چچا گنگنانے لگے اور میں نے اخبار اٹھا لیا۔ اخبار حسب معمول سیاسی بیانوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں اخبار رکھ کر گلی میں نظریں دوڑانے لگا۔
کچھ دیر ہی گزری تھی کہ میں نے خالہ سکینہ کو آتے دیکھا۔ وہ پورے محلے کی خالہ تھیں اور اپنی تیز زبان اور کرارے جوابوں کی بدولت بہت شہرت رکھتی تھیں۔ خاص طور پر چچا ہادی سے اکثر ان کی اَن بَن رہتی تھی۔ وہ گلی میں نظریں دوڑاتی چلی آ رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کچھ ڈھونڈ رہی ہیں۔ چچا کے گھر کے آگے سے گزرتے ہوئے اُنھوں نے بورڈ پر نظر ڈالی، رُک کر اندر جھانکا پھر دروازے کے قریب آ کر بولیں:
''اے تم لوگ یہاں کیا بیچ رہے ہو؟''
چچا غصے سے پیچ و تاب کھانے لگے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اُلٹا سیدھا جواب دیتے میں نے جلدی سے کہا ''ہم یہاں قسمت کا حال بتاتے ہیں۔'' وہ اندر چلی آئیں اور بولیں: ''تو ذرا میری چہیتی مرغی کا تو پتا لگاؤ۔ نگوڑی صبح سے غائب ہے۔''
میں نے بڑی مشکل سے ہنسی کو روکا۔ چچا غصے سے بولے ''ہم ایسے کام نہیں کرتے، پچاس روپے فیس ہے۔''
خالہ کرسی پر بیٹھ گئیں اور بولیں: ''ہاں خیر سے مرغی مل جائے تو فیس بھی دے دیں گے۔''
''لاؤ ہاتھ دکھاؤ۔'' چچا نے کہا۔
خالہ ہنس کر بولیں: ''ہاتھ دکھاؤں گی تو تم بھاگتے نظر آؤ گے۔''
چچا گڑبڑا گئے، بولے: ''میرا مطلب ہے ہمیں مرغی ڈھونڈنے کے لیے ستاروں سے مدد لینی پڑے گی۔''
''جس سے بھی مدد لو۔ لیکن میری مرغی ڈھونڈ دو۔''
''تمھاری مرغی کب سے غائب ہے؟''
''صبح نکلی تھی باہر اس کے بعد سے نہیں دیکھا۔'' خالہ بولیں۔
''صبح کھایا کیا تھا؟''
''ناشتہ کیا تھا اور کیا کھایا تھا۔ کیا بے تکے سوال کیے جا رہا ہے۔'' خالہ غصے سے بولیں۔
''میں تمھارے نہیں مرغی کے کھانے کی بات کر رہا ہوں۔'' چچا تلملا کر بولے۔ خالہ زور سے ہنسیں اور

بولیں۔ ''اے لو! مجھے کیا معلوم وہ تو صبح سویرے ڈربے سے نکل کر گلی میں چلی جاتی ہے۔ عرصہ ہوا میں نے اسے کھلانا چھوڑ دیا ہے خود ہی گلی میں کچھ چگ لیتی ہوگی۔''

خالہ کی مرغی سارا دن گلی میں گھومتی رہتی تھی، کھلے دروازوں سے دوسروں کے گھروں میں چلی جاتی اور جہاں کچھ کھانے کی چیز نظر آتی تو اس سے مشکل ہی بچ پاتی تھی، لیکن وہ انڈے ہمیشہ اپنے ڈربے میں جا کر ہی دیتی تھی۔ میں ان کی باتیں دلچسپی سے سن رہا تھا۔

چچا اپنی کرسی پر بے چینی سے پہلو بدل کر بولے۔

''تمھیں کسی پر شک ہے؟''

''کیسا شک؟'' خالہ نے پوچھا۔

''ہوسکتا ہے کسی نے مرغی اُڑا لی ہو؟'' چچا عیاری سے بولے۔ چچا نے اپنی پٹری بدل لی تھی، وہ جاسوسی پر اتر آئے تھے۔

''مجھے تو تم پر شک ہے۔'' خالہ بولیں۔

چچا اُٹھ کھڑے ہوئے اور بولے: ''اسی وقت میرے دفتر سے نکل جاؤ میں تمھارا کام نہیں کروں گا۔''

خالہ اطمینان سے بیٹھی رہیں اور بولیں: ''تمھیں فیس سے مطلب رکھنا چاہیے۔''

چچا فیس کا نام سن کر واپس بیٹھ گئے اور اگلے سوال پر آتے ہوئے بولے: ''کیا تم نے اس کے برتاؤ میں کچھ تبدیلی محسوس کی تھی یعنی اس کا رویہ کچھ بدلا تھا؟''

''تبدیلی......'' خالہ نے خود کلامی کی اور سوچ میں پڑ گئیں۔ ایک منٹ گزر گیا۔ خالہ سوچ میں ڈوبی تھیں۔ وہ، وہ کام کر رہی تھیں جو اُنھوں نے کبھی نہیں کیا تھا۔ وہ ایک عملی عورت تھیں، سوچ و بچار سے ان کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ہم منتظر تھے۔

وہ بڑبڑائیں۔ ''تبدیلی تو نہیں البتہ......'' اور خاموش ہوگئیں۔

چچا بے چینی سے بولے: ''البتہ......''

میرے منھ سے بے اختیار نکلا: ''البتہ......''

خالہ سکینہ بولیں ''البتہ......وہ کچھ اُداس تھی۔''

چچا ہادی نے زور سے ٹیبل پر ہاتھ مارا اور بولے: ''بس مسئلہ حل سمجھو۔ ایک گھنٹے میں یا تو تمھاری مرغی مل جائے گی یا اس کے بارے میں پتا چل جائے گا۔ لاؤ فیس نکالو۔''

میں نے چچا کو حیرت سے دیکھا۔ خالہ نے بٹوے سے پچاس روپے نکال کر ٹیبل پر پھینکے اور بولیں: ''اگر تم نے دھوکا دیا تو میں ایک کے دس وصول کرنا جانتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ طمطراق سے چلتی ہوئی باہر نکل گئیں۔ میں نے سوالیہ نظروں سے چچا کی طرف دیکھا۔ وہ سرگوشی میں بولے۔

''میاں بھتیجے میرا خیال ہے خالہ کی مرغی آنجہانی ہوچکی ہے یا تو وہ کسی کے کام و دہن کی لذت کا شکار ہوچکی ہے یا ہونے والی ہے۔ تم ایک کام کرو۔ محلے کا چکر

لگاؤ۔ یہ کھانے پکنے کا وقت ہے۔ ذرا سونگھ کر اندازہ لگاؤ، کتنے گھروں میں گوشت پک رہا ہے۔"

میں نے اس عجیب کام پر اُنھیں حیرت سے دیکھا اور کہا: "میں نے ایسا کام کبھی نہیں کیا اور آپ بھول رہے ہیں کہ ہم پامسٹ بنے تھے نا کہ دوسروں کے گھروں میں تاک جھانک کرنے والے۔"

"میں جھانکنے کو نہیں صرف سونگھنے کو کہہ رہا ہوں اور میاں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو وقت اور حالات کے مطابق چلتے ہیں۔"

میں بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا اور پورے محلے کا چکر لگایا۔ وہ مہینے کی آخری تاریخیں تھیں۔ ایک دو گھروں سے ہی مجھے گوشت کی خوشبو آئی۔ میں نے آکر چچا کو بتایا۔ وہ شرلاک ہومز کی طرح گردن ہلاتے ہوئے بولے۔ "اچھا ایک پاپڑ کے بیوپاری ہیں اور دوسرے حوالدار خاں صاحب! مہینے کے آخری دنوں میں بیوپاری کے ہاں سے گوشت کی خوشبو آنا تو سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن حوالدار خان صاحب؟"

وہ سوچ میں ڈوب گئے۔ حوالدار صاحب، پولیس کے محکمے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد چچا بولے: "میاں بھتیجے اس کا مطلب ہے حوالدار خاں صاحب نے مرغی پر ہاتھ صاف کر دیا ہے۔ اب سوچنا پڑے گا کہ آگے کیا کرنا ہے۔" وہ خاموش ہو گئے۔

کچھ دیر بعد میں تھوڑی دیر واپسی کا کہہ کر گھر چلا گیا۔

حضرت جنید بغدادیؒ اور بیمار کتا

حضرت جنید بغدادیؒ ایک دفعہ ریگستان میں جا رہے تھے کہ انہیں ایک کمزور اور زخمی کتا نظر آیا جو بھوک سے مر رہا تھا۔ حضرت جنیدؒ نے اپنی سفر کی خوراک میں سے آدھی اسے کھلا دی اور وہ اٹھ بیٹھا۔ کہتے ہیں کہ حضرت جنیدؒ وہاں سے جاتے وقت رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ کون جانتا ہے کہ ہم دونوں میں سے اللہ کے نزدیک کون بہتر ہے۔ اس لیے کہ کتا جب مر جائے گا تو اپنی بدنامی کی وجہ سے اس کو جنت میں نہ لے جائیں گے۔ (حکایتِ سعدی)

مرسلہ: شاہد حفیظ، میلسی

مجھے آنے میں پندرہ منٹ لگے۔ جب میں چچا کے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے اندرونی دروازے کو تیزی سے بند ہوتے دیکھا۔ چچا کا کہیں اتا پتا نہ تھا۔ میں نے اخبار اُٹھایا اور خبروں پر نظر دوڑانے لگا۔ اچانک حوالدار خان صاحب کا دروازہ کھلا اور وہ باہر نمودار ہوئے۔ وہ ایک لحیم شحیم آدمی تھے۔ بڑی بڑی مونچھیں چہرے پر سجی تھیں۔ وہ ہر وقت غصے میں نظر آتے تھے۔ انھوں نے گلی میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور سیدھے ہمارے دفتر کی طرف چلے آئے۔ میں بلاؤں سے بچنے کی دعا یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ حوالدار صاحب کی مونچھیں پھڑک رہی تھیں۔

دروازے پر آکر وہ کرخت لہجے میں بولے۔ "تم نے ابھی کسی کالے برقعے والی عورت کو میرے گھر سے

نکلتے دیکھا ہے؟''

''جی نہیں۔'' میں نے جلدی سے جواب دیا۔

''تمھارا پروفیسر کہاں ہے؟''

''وہ تو بہت دیر سے اندر ہیں۔''

حوالدار صاحب واپس پلٹ گئے، لیکن وہ بہت بے چین نظر آ رہے تھے۔ گلی میں ایک بار پھر سناٹا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اندرونی دروازہ کھلا اور چچا بلی کی سی چال چلتے باہر آئے۔ ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ میرے قریب آ کر وہ دھیرے سے بولے: ''میاں بھتیجے مسئلہ حل ہو چکا ہے مرغی کی باقیات (پَر وغیرہ) حوالدار خان صاحب کے صحن میں پڑے ہیں۔'' انھوں نے ایک پرچہ اٹھایا اور اس پر کچھ لکھ کر بولے:

''یہ خالہ سکینہ کو دے آؤ۔''

میں نے پوچھا۔ ''آپ کو کیسے پتا چلا کہ پَر حوالدار صاحب کے ہاں پڑے ہیں؟'' وہ عیاری سے مسکرائے اور بولے: ''میاں یہ کاروباری راز ہے اسے مت پوچھو۔'' میں نے پرچہ لیا اور باہر نکلنے لگا تو چچا دوبارہ گویا ہوئے۔ ''اور ہاں ہم ابھی کچھ دیر کے لیے دفتر بند کر رہے ہیں۔ تم بھی گھر جاؤ اور اچھے بچوں کی طرح کوئی کہانی پڑھو۔''

میں نے حیرت سے انھیں دیکھا اور کندھے اُچکا کر باہر نکل گیا۔

پرچہ خالہ کو دے کر میں اپنے گھر چلا گیا۔ میں نے ابھی گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ باہر سے شور کی آواز سنائی دی۔ میں اُلٹے قدموں باہر آیا تو دیکھا خالہ سکینہ، حوالدار خان صاحب کے دروازے پر کھڑی ہیں چند ہی منٹوں میں اُنھوں نے ایسا ادھم مچایا کہ پورا محلّہ اپنے گھروں سے باہر آ گیا۔ اُنھوں نے حوالدار صاحب کو رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔ وہ مرغی کے بچے کھچے پَر ٹھکانے لگانے کے لیے ایک تھیلی میں ڈال رہے تھے کہ خالہ نے انھیں جا لیا اور تابڑ توڑ ایسے حملے کیے کہ حوالدار صاحب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ خالہ کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ خاں صاحب فوراً انھیں ہزار روپے سکہ رائج الوقت ادا کریں۔ سب لوگ بھی خالہ کا ساتھ دے رہے تھے۔ خاں صاحب کو ہزار روپے دینے پڑے۔ خالہ بڑبڑاتی ہوئی گھر لوٹ گئیں۔

لوگ بھی جو اس بے وقت کے تماشے سے فیض یاب ہو چکے تھے۔ گھروں میں چلے گئے۔ چچا ہادی کا کہیں پتا نہ تھا۔ بہت دنوں تک حوالدار صاحب اس برقع والی عورت کو ڈھونڈتے رہے جس نے ان کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔ میری بھی آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ عورت کون تھی اور چچا ہادی کو کیسے پتا چلا کہ خاں صاحب کے صحن میں مرغی کے پَر پڑے ہیں۔ آپ لوگ زیادہ سمجھدار ہیں، شاید آپ سمجھ گئے ہوں۔

☆......☆
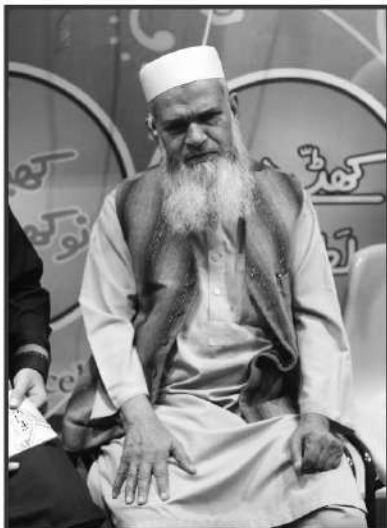
قطعاتِ تاریخِ وفات

اشتیاق احمد

تنویر پھول

(اُردو نیٹ جاپان اور بزمِ قلم کے ذریعے خبر ملی کہ معروف ادیب اشتیاق احمد ایکسپو سینٹر کراچی کے عالمی کتب میلے میں شرکت کے بعد واپس جاتے ہوئے کراچی ایئر پورٹ پر ۱۷ نومبر ۲۰۱۵ء کو منگل کے روز انتقال کر گئے، اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ اُن کی، تمام مرحومین کی اور ہم سب کی مغفرت فرمائے، آمین)

قطعۂ تاریخ ہجری

مفتخر اُن پر ہے بچوں کا ادب
قیمتی ان کی ہیں تصنیفات کُل
پھوؔل! تھا پنجاب میں اُن کا قیام
"اشتیاق احمد ادیبِ شہرِ گل"
(۱۴۳۷ ہجری)

قطعۂ تاریخ عیسوی

ناولیں دلچسپ وہ لکھتے رہے
آہ! آخر چل بسے مردِ رشید
پھوؔل! اُن کی خوب تھی منظر کشی
"اشتیاق احمد وہ حُسنِ باغِ دید"
(۲۰۱۵ عیسوی)

قارئین ساتھی کے حسِ مزاح کو جانچنے کے لیے ماہنامہ ساتھی نے شروع کیا ہے۔ان کے لیے ایک انعامی سلسلہ۔جس میں ہر ماہ بہترین اور دلچسپی سے بھرپور لطیفے بھیجنے والے قارئین ساتھی کو **ڈیئر پنسل** اور بال پین بنانے والے ادارے **انڈس پنسل انڈسٹریز** کی جانب سے دیا جائے گا خوبصورت تحفہ......تو پھر قلم سنبھالیے اور مزاح کے اس دوڑ میں شامل ہو جائیں...... جہاں ''ذرا کھلکھلائیے'' آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ نوٹ: لطیفہ روانہ کرتے ہوئے اس پر اپنا نام، مکمل پتا اور فون نمبر لکھنا مت بھولیے گا۔

شکر سے میٹھا

ایک خربوزے والا چیخ چیخ کر خربوزے بیچ رہا تھا۔ ''شکر سے میٹھا خربوزہ لے لو۔'' ایک گاہک نے خربوزہ خریدا اور وہیں اسے کھانے لگا۔ اگلے ہی لمحے اس گاہک نے غصے سے کہا: ''ارے...... یہ تو بالکل پھیکا ہے۔''

خربوزے والے نے کہا: ''ارے صاحب! کہہ تو رہا ہوں کہ شکر سے میٹھا لگے گا، شکر تو لگاؤ۔''

مرسلہ: کومل فاطمہ اللہ بخش، کراچی

☆......☆

آخری سین

ڈائریکٹر (فلم کے ہیرو سے) ''اگلے سین میں تمھیں

دریا میں کودنا ہوگا۔“

ہیرو گھبرا کر بولا: ”مگر مجھے تیرنا نہیں آتا۔“

ڈائریکٹر: ”کوئی بات نہیں، یہ فلم کا آخری سین ہوگا۔“

مرسلہ: رافع شیخ، کراچی

☆......☆

بے وقوف

ایک بے وقوف دریا میں دہی ڈال رہا تھا۔

دوسرا بے وقوف: ”یہ کیا کر کر رہے ہو؟“

پہلا: ”لسی بنا رہا ہوں۔“

دوسرا: ”تمھاری انھی باتوں کی وجہ سے لوگ ہمیں بے وقوف کہتے ہیں۔ ارے بھائی اتنی ساری لسی پیے گا کون؟“

مرسلہ: محمد فخر جہاں سعیدی، کراچی

☆......☆

اندر یا باہر

دو لڑکے ایک بھاری ڈبے کو کھینچ رہے تھے۔ وہ زور لگاتے تھک گئے اور ہانپنے لگے۔

ایک لڑکے نے کہا: ”چلو چھوڑو، ہم اسے باہر نہیں نکال سکیں گے۔“

دوسرے لڑکے نے چونک کر کہا: ”ارے! اسے باہر لے جانا ہے؟ میں تو سمجھ رہا تھا کہ اسے اندر لانا ہے۔“

مرسلہ: محمد عمر بن عبدالرشید، کراچی

☆......☆

ناراض

ڈاکٹر نے نرس کو بلا کر پوچھا: ”وہ کنجوس مریض کیوں ناراض ہو رہا ہے، اب کیا ہوا؟“

نرس نے جواب دیا: ”وہ اب اس بات پر ناراض ہو رہا ہے کہ دوا ختم ہونے سے پہلے وہ ٹھیک کیوں ہو گیا۔“

مرسلہ: محمد عمر بن عبدالرشید، کراچی

☆......☆

نام

ایک چوزہ اپنی ماں مرغی سے بولا: ”ماں جب انسان پیدا ہوتے ہیں تو اپنا نام رکھ لیتے ہیں ہم لوگ ایسا کیوں نہیں کرتے؟“

مرغی: ”بیٹا ہمارے نام مرنے کے بعد رکھے جاتے ہیں، جیسے کہ چکن ملائی بوٹی، چکن تکہ، چکن فرائی، چکن روسٹ، چکن چلی، چکن کڑاہی وغیرہ وغیرہ۔

مرسلہ: ماہ رخ، حیدر آباد

☆......☆

سوراخ

انعامی لطیفہ

ایک روز چند آدمی کشتی میں بیٹھے دریا کی سیر کر رہے تھے کہ اچانک کشتی میں سوراخ ہو گیا اور پانی اندر داخل ہونے لگا سب لوگ خوفزدہ ہو کر شور مچانے لگے۔ ان میں سے ایک شخص نے کہا اس قدر شور مچانے کی کیا ضرورت ہے۔ میری مانو تو کشتی میں ایک سوراخ اور کر لو تا کہ ایک سے

پانی اندر داخل ہو اور دوسرے سے باہر نکل جائے۔

مرسلہ: مریم نوری، سرگودھا

☆......☆

گدھے

پہلا آدمی: ''اس بوسیدہ مکان میں بالکل نہ رہیے اس میں صرف گدھے ہی رہ سکتے ہیں۔''

دوسرا آدمی: ''یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

پہلا آدمی: '' میں اس میں چار سال رہ چکا ہوں۔''

مرسلہ: ساجد بلوچ، سکھر

☆......☆

بھول

خاوند: ''ارے میں چھتری لے جانا بھول ہی گیا۔''

بیوی: ''تو پھر آپ کو کیسے یاد آیا؟''

خاوند: '' بارش رک جانے کے بعد میں نے چھتری بند کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو یاد آیا کہ چھتری تو میں گھر ہی بھول آیا ہوں۔''

مرسلہ: عالیہ رمیز، کراچی

☆......☆

شکار

ایک شکاری (دوسرے شکاری سے) '' میں نے شیر کو چیر پھاڑ دیا۔ ہاتھی کو سونڈ سے پکڑ کر نیچے پٹخ دیا۔ گینڈے کو مکا مار کر ڈھیر کر دیا۔''

دوسرا شکاری حیرت سے ''پھر کیا ہوا؟''

پہلا شکاری: '' ہونا کیا تھا کھلونوں کی دکان کے مالک نے مجھے باہر پھینک دیا۔''

مرسلہ: خدیجہ عارف، لاہور

☆......☆

جیت یا ہار

انعامی لطیفہ

ایک آنکھ والے شخص نے دوسرے شخص سے جس کی دونوں آنکھیں تھیں شرط لگائی کہ میں تم سے زیادہ دیکھتا ہوں۔

''وہ کیسے؟'' دو آنکھ والے نے کہا۔

''میں تمہاری دونوں آنکھیں دیکھ رہا ہوں اور تم صرف ایک آنکھ دیکھ رہے ہو۔ تم ہار گئے اور میں جیت گیا۔''

مرسلہ: عمر سلیمان، ملتان

☆......☆

موئن جودڑو

پہلا دوست: ''موہن جودڑو کو لوگ دور دور سے دیکھنے کیوں آتے ہیں؟

دوسرا دوست: ''اس لیے اس کے قریب کوئی رہتا ہی نہیں۔''

مرسلہ: مریم کاشف، حیدر آباد

☆......☆

ننھے فرشتے

توقیر عائشہ

اُس کا تعلق ایک اہم چیز سے ٹوٹ گیا تھا جسے دو ننھے فرشتوں نے جوڑا

بھابھی باورچی خانے سے قلم ہاتھ میں لیے غصے میں برآمد ہوئیں۔

"یہ کچن والے کیلنڈر سے صفحہ کس نے پھاڑا ہے؟ میں نے بہت ڈھونڈ کر لیا تھا ایسا کیلنڈر جس میں تاریخ کے خانے بڑے بڑے ہوں۔ روز کے دودھ کا حساب اور ضروری چیزیں لکھی تھیں اس میں۔"

بے اختیار میری نظر معصوم صورت بھتیجے اور بھتیجی پر پڑی جو خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف کھسک رہے تھے۔ معمول کے کاموں میں اچانک در آنے والی بے ترتیبی میں اکثر اِن دونوں ہی کا ہاتھ ہوتا تھا۔ جیسے ہی

وہ میرے پاس سے گزرنے لگے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر دونوں کو پکڑ لیا۔

"چاچو! چھوڑیں ہم کمرے میں جا رہے ہیں۔" ثناء نے گڑبڑا کے کہا۔ میں نے اس کے کان میں پوچھا۔

"کیلنڈر تک تو نومی کا ہاتھ نہیں جا سکتا۔ نومی نے تو نہیں پھاڑا نا؟"

اس نے سرگوشی کی۔ "نہیں چاچو! وہ اسٹول رکھا ہے نا کچن میں اس پر چڑھ کر میں نے پھاڑا تھا۔ مس نے دو (۲) سے ڈک (بطخ) بنانا سکھایا تھا۔ اس میں بہت سارے بڑے بڑے 2 بنے تھے۔ میں چکرا گیا۔

"2 سے ڈک کیسے بنتی ہے؟" میں نے بھی چپکے سے پوچھا۔ "آپ ہمارے ساتھ چلیں آپ کو بھی سکھا دیں گے۔"

"چلو۔" میں نے بھی بھابھی کی گھورتی نگاہوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

جب ہم تینوں کمرے میں پہنچے تو عمیر نے پلنگ کے نیچے پڑے ہوئے کٹے پھٹے صفحے میں سے ایک 2 کا ہندسہ برآمد کیا۔ ایک رنگین پنسل سے اس پر مزید لکیریں اور نصف دائرے بنا کر اسے بطخ کی شکل دے دی۔ بھابھی کے لکھے سارے حساب کتاب برابر ہو چکے تھے۔ اب تو جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ اگلا مرحلہ انھیں ڈانٹ سے بچانے کا تھا جو بخیر و خوبی انجام پا گیا کیونکہ مجھے اب اس کی بھی کافی مشق ہو گئی تھی۔

یہ تھے میرے پیارے بھتیجا اور بھتیجی۔ پانچ سالہ نومی اور چھے سال کی ثناء۔ شکل سے معصوم اور اپنی عقل سے بڑھ کر کام کرنے کو تیار۔ نت نئی شرارتیں کر کے کبھی ڈانٹ کھاتے اور کبھی سب کو ہنسنے پر مجبور کر دیتے۔

ابھی دو دن پہلے کی بات ہے۔ گیلی روئی سے خرگوش بنانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ وہ بھی میرے کمرے میں چھپ کے اور میرے ہی لحاف کے کونے سے روئی نکال کے۔ جب کسی کے آنے کی آہٹ سنی تو جھٹ وہ گیلی روئی میری مسہری کے نیچے رکھے جوتوں میں چھپا دی اور اس بات کا پتا مجھے اس وقت چلا جب میں نے یونی ورسٹی جاتے ہوئے جوتے پہننے کے لیے اٹھائے۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ ہے مگر گھر کی رونق انھیں کے دم سے ہے۔

☆......☆

چھٹی کے دن بھابھی نے ایک مسئلہ پیش کیا۔ "ہمیں اس گھر میں آئے ہوئے دو مہینے ہونے والے ہیں۔ ماسی، دودھ والا، اخبار والا، اسکول وین سب کچھ ترتیب پا گیا ہے لیکن ایک بات کی طرف آپ توجہ ہی نہیں دیتے۔" بھابھی نے بھائی جان کو مخاطب کیا تھا۔

"اب کون سا کام رہ گیا ہے بھئی؟" بھائی جان نے پوچھا۔

"بچوں کے قاری صاحب کا بندوبست ابھی تک نہیں ہوا۔ آخر یہ کب سپارہ پڑھیں گے؟" بھابھی نے

سوال کیا۔
''میں تو آفس چلا جاتا ہوں۔ تم ہی ڈھونڈو کوئی قاری۔'' بھائی جان نے دامن بچانے کی کوشش کی۔
''واہ! میں سڑکوں سڑکوں قاری ڈھونڈتی پھروں۔ پرانے قاری صاحب نے بھی یہاں آنے سے منع کر دیا ہے۔ انھیں دور پڑتا ہے۔''
''اچھا تو پاس پڑوس میں پتا کرو۔'' بھائی نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔ بھابھی میری طرف رخ کر کے بولیں۔
''سنو شاہد! اپنے دوستوں میں، مسجد وغیرہ میں پتا کرو کسی اچھے قاری کا۔''
''اچھا جی! کرتے ہیں پتا۔'' میں نے انھیں اطمینان دلایا۔
عصر میں مسجد کے قاری صاحب کے پاس گیا تو وہاں پچاس کے قریب بچے پڑھ رہے تھے۔ ہر عمر کے بچے تھے اور شرارتیں بھی خوب کر رہے تھے۔ قاری صاحب نے گھر آ کر پڑھانے سے معذرت کر لی۔ یہاں اتنے بچے آتے تھے کہ ان کے پاس وقت ہی نہ تھا۔ بھابھی کو بتایا تو اُنھوں نے مسجد بھیجنا پسند نہ کیا۔ یہ ابھی چھوٹے تھے اور لانے لے جانے کا بھی مسئلہ ہوتا۔ ایک پڑوسی باہر اپنے پودوں میں پانی ڈال رہے تھے۔ ان سے ذکر کیا تو اُنھوں نے اپنے گھر آنے والے قاری صاحب کو شام میں بھیجنے کا وعدہ کیا۔ شام

قرض (حکایت سعدی)

چند غریب کسی بنیے کے قرض دار ہو گئے تھے۔ بنیا روز تقاضے پر تقاضا کرتا اور ساتھ ہی سخت باتیں بھی سنا دیا۔ مگر غریب برداشت کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے تھے۔ ایک دانا نے واقعے سے واقف ہو کر فرمایا: ''اپنے نفس کو کھانے کے وعدے پر ٹالنا، بنیے کو روپوں کے وعدہ پر ٹالنے سے زیادہ آسان تھا''۔

مرسلہ: شاہد حفیظ، میلسی

میں قاری صاحب سے بات ہو گئی اور یوں ثناء اور نومی کی چھوٹی چھوٹی...... آوازیں گھر میں گونجنے لگیں۔
مگر یہ انتظام تھوڑے ہی دن چل سکا۔ قاری صاحب کو اپنے کسی کام سے گاؤں جانا پڑا اور پڑھائی کا سلسلہ رک گیا۔ ناچار بھابھی نے اب خود پڑھانے کی ٹھان لی۔ مگر وہ اپنی امی سے ٹھیک طرح سے پڑھتے ہی نہ تھے۔ ایک دن میں ٹیوشنز پڑھا کر گھر واپس آیا تو دونوں بڑے خاموش بیٹھے تھے۔ لگتا تھا اچھی خاصی ڈانٹ پڑی ہے۔ مجھے دیکھ کر بھابھی کہنے لگیں۔ ''اب تم ایک ایسا مولوی لاؤ جو بڑا سا ہو، موٹی جس کی موٹی لال آنکھیں ہوں اور بڑا سا ڈنڈا بھی ہو اس کے پاس۔''
میں نے کہا: ''ایسا کرتے ہیں اخبار میں اشتہار دے دیتے ہیں کہ موٹی اور لال آنکھوں والے ڈنڈا بردار

قاری کی ضرورت ہے۔''
بھابھی ذرا زور سے بولیں: ''ارے تمھیں مذاق سوجھ رہا ہے۔ قاری کوئی ملتا نہیں، مجھ سے پڑھتے نہیں۔ ان کی عمر نکلی جا رہی ہے، کیا میرے بچے جاہل ہی رہیں گے۔ جب میں مروں گی تو مجھے قرآن پڑھ کر بخشیں گے بھی نہیں؟'' بھابھی تو ایک دم جذباتی ہو گئی تھیں۔
میں نے کہا: ''ارے بھابھی! اس زمانے کے بچے ایسے ہی ہیں۔ گھر کے کسی فرد سے امی یا باجی سے نہیں پڑھتے۔ سب ہی یہ شکایت کرتے ہیں۔ ایک ہمارا زمانہ تھا کہ کبھی قاری کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ چچا کے ساتھ مشترکہ گھر میں رہتے تھے۔ مجھے تو چچا جان نے ہی قاعدہ اور ناظرہ قرآن پڑھایا ہے۔ ویسے ان کے الفاظ کی ادائیگی بڑی زبردست تھی۔ ان کی تلاوت کی نقل کرتے اور ان سے سیکھنے سے میری بھی تلاوت بہت اچھی ہو گئی تھی۔ امی ابو تو مجھے پاس بٹھا کر سنا کرتے تھے۔''
''اچھا تم نے اپنے چچا سے پڑھا ہے؟ اور تلاوت بھی درست مخارج سے کرتے ہو نا؟'' بھابھی کی آنکھیں کسی خیال سے چمکنے لگی تھیں۔ ''تو تم بھی تو ان کے چچا ہی ہو۔ اب تم ہی اِنھیں پڑھاؤ گے۔ واہ قاری گھر میں ہے اور ہم سارے شہر میں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔''
بھابھی کی بات سن کر میں گھبرا گیا۔ ''بھابھی! میں کیسے پڑھا سکتا ہوں۔ انجینئرنگ کا آخری سال ہے، میٹرک کے بچوں کو ٹیوشنز پڑھا کر مغرب بعد تو گھر آتا ہوں۔''
بھابھی نے ناراضی سے کہا: ''ہاں ہاں! دنیا بھر کے بچوں کو حساب کا مشکل مضمون پڑھاتے ہو اور گھر کے بچوں کو قرآن نہیں پڑھا سکتے۔ مجھے کچھ نہیں سننا کل سے روزانہ رات میں آدھ گھنٹہ اِنھیں پڑھاؤ گے۔''
سامنے ہی میز پر نورانی قاعدہ رکھا تھا۔ بھابھی نے وہ بھی جھٹ پٹ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔
''اچھا بھابھی! دیکھتا ہوں۔'' میں نے ٹھنڈی آہ بھری اور اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ سیپارہ میز پر رکھ کر ذرا لیٹا ہی تھا کہ عشاء کی اذان ہو گئی پھر نماز کھانے اور بچوں سے گپ شپ کے بعد ہی کمرے میں واپسی ہوئی۔
یوں ہی میز پر رکھے قاعدے کو اٹھا لیا۔ قاعدے سے وہی مانوس سی خوشبو آ رہی تھی۔ جو میرے سیپارے میں سے بھی آتی تھی۔ یہ خوشبو مجھے میرے بچپن میں لے گئی۔ جب میں چچا جان کے ساتھ پڑھتا تھا۔ میں بڑی محبت سے صفحے پلٹتا جا رہا تھا کہ مشکل الفاظ پر مشتمل آخری اسباق نکل آئے۔ اِنھیں پڑھنے لگا تو مجھ پر ایک ہولناک انکشاف ہوا۔ میں اَٹک رہا تھا...... کسی نو آموز کی طرح...... انجینئرنگ کا ہونہار طالب علم۔ حساب کے مشکل سوال منٹوں میں حل کرنے والے بہترین دماغ کا حامل قرآن پڑھنا

بھول رہا تھا۔

چھوٹے بچے نے تو سیکھا ہی نہیں ہوتا اس لیے اُٹکتا ہے۔ میں نے تو سیکھا تھا۔ سب میری تلاوت شوق سے سنتے تھے۔ یہ کیا ہوا تھا؟ دراصل میں نے بہت دنوں سے قرآن پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ جس کے پاس بہت دن تک نہ جاؤ اس سے تعلق ٹوٹ ہی تو جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ میٹرک کے بعد میں نے ترجمہ اور تفسیر سے پڑھنے کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا تھا۔لیکن انٹر میں مارکس لینے کی دھن میں رفتہ رفتہ یہ سلسلہ ختم ہوگیا تھا۔ خاندان بھر کو میری ذہانت سے بڑی اُمیدیں تھیں۔ ان اُمیدوں کو پورا کرنے کے چکر میں محض قرآن کی تلاوت تک رہ گیا تھا۔ فجر کے بعد کچھ حصہ پڑھ لیتا تھا۔ انٹر کے بعد رات دیر تک پڑھ کر فجر کی نماز قضا کر کے تلاوت کا بھی ہوش ہی کہاں رہتا تھا۔ ناشتہ کیا، بائیک پکڑی اور کالج پہنچا۔ پھر ٹیوشن پڑھنے پڑھانے کے سلسلے، قرآن سے تو میرا تعلق ٹوٹ ہی گیا تھا۔ مجھے لگا امی بھی جیسے شکایت کر رہی ہوں۔ بیٹا کتنے دن سے مجھے اپنی تلاوت کا تحفہ نہیں بھیجا۔ اس سال رمضان میں بھی صرف ۱۷ پارے ہی پڑھ سکا تھا۔ اب سیپارہ ہاتھ میں آیا تو حرف مجھ سے روٹھ گئے تھے۔ ناراض ہوگئے تھے۔ بچوں کو کیا پڑھاتا میں تو خود ہی سبق بھول گیا تھا۔

میری نگاہ قدرے بلندی پر لگے ریک پر پڑی جہاں قرآن کریم کا مجلد نسخہ رکھا تھا۔ مجھے رونا آ گیا پچھلے جمعے کو آدھی سورۃ کہف پڑھ کر رکھ دیا تھا۔ اس پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ میں نے اُٹھا کر چوما اور ہاتھوں سے گرد صاف کی۔ درمیان سے کھول کر تلاوت شروع کی۔ پہلے آہستہ پھر قدرے بلند آواز سے۔ مجھے خوشی ہوئی میں پڑھ سکتا تھا۔ پڑھتا چلا گیا۔ کچھ دیر یوں ہی بلند آواز سے تلاوت کر کے قرآن بند کر کے رکھا اور پلٹا تو پیچھے نومی کو کھڑا پایا۔

”ارے! تم سوئے نہیں ابھی تک۔“ میں نے نومی سے کہا: ”ابو نے یو ایس بی منگوائی ہے۔ چاچو! آپ تو بہت اچھا قرآن پڑھتے ہیں اب تو میں آپ سے ہی پڑھوں گا۔“

”ضرور پڑھاؤں گا ننھے فرشتے۔ تمھاری وجہ سے ہی تو مجھے بھولا ہوا سبق یاد آیا ہے۔“ میں نے کہا اور اسے پیار سے گود میں اٹھالیا۔

☆......☆

منافع

ملانصیر الدین نے ایک بکری چرائی اور ذبح کر کے اس کا گوشت صدقہ کر دیا۔

کسی نے ملامت کی تو کہنے لگے: ”چوری کا گناہ اور صدقے کا ثواب تو برابر ہوگئے اور کھال مجھے منافع میں مل گئی۔“

مرسلہ: ناعمہ تحریم، ملیر ہالٹ

کوشش جاری رکھیں

تحریر	قلمکار	کیفیت
جادو کا حلوہ	ن۔س	قواعد کا خیال نہیں رکھا گیا
نیکی	ط۔ب۔ف	مزید محنت کریں
ختم الرسلؐ کی زندگی	ح۔ا۔ر۔ق	مزید محنت کریں
دو دوست	س۔ع	مزید محنت کریں
برائی کا نتیجہ براہی ہوتا ہے	ح۔ع۔و۔ح۔ق	مزید محنت کریں
مہکتی کلیاں	ر۔ن	مزید محنت کریں
عقل مندی کسی کی میراث نہیں	ر۔ب	بچوں کے لیے غیر مناسب
ہمارا فخر	ف۔م۔ذ	عمومی خیال
اللہ جی تم سچ مچ پیارے ہو	ث۔ر۔د	شائع شدہ
تابونگ حاجی	سمعیہ لیاقت	انتخاب
عجیب لڑکی	ا۔ع۔ط	شائع شدہ
بے حد عمدہ ساتھی ملا ہے	س۔ذ۔ح۔ن	وزن سے خارج
کام کی بات	ر۔ع	رابطہ نمبر نہیں لکھا
بلیک وارنٹ	م۔ص۔ن	نامکمل
نظم	ا۔ح۔ط	وزن سے خارج
غرور کا انجام	م۔س۔ش	وزن سے خارج
ماں کی شان	م۔م۔س	مزید محنت کریں
حمد	م۔خ	وزن سے خارج
بچوں کی نظم	ش۔ج۔س	مزید محنت کریں
میری کتاب	م۔خ	مزید محنت کریں
چالاک بھالو	ش۔ج۔س	وزن سے خارج
آم	ب۔خ۔م	وزن سے خارج
نماز	ڈ۔س۔ن۔ا۔ج	وزن سے خارج

دنیا بھر میں تتلیوں کی ۱،۵۰،۰۰۰ (ایک لاکھ پچاس ہزار) سے زائد اقسام پائی جاتی ہیں۔ بکائی تتلی (Buck Eye) کا حیاتیاتی نام Junonia Coenia Coenia ہے۔ یہ رس خور تتلی صوبہ خیبر پختونخوا اور ہمالیہ کی بلندیوں پر ملتی ہے۔ موسم بہار میں یہ ننھی تتلی ۳۰۰۰ سے زائد انڈے دیتی ہے جن میں سے بمشکل ۱۰۰ اسن بلوغت تک پہنچ پاتی ہیں۔ ان کی زندگی کا دورانیہ بہت قلیل یعنی صرف چھ ماہ تک ہوتا ہے۔

سمندر کے نیچے قدیم شہر

جنوبی افریقا کے ساحلی شہر ڈربن سے کچھ دوری پر سطح سمندر سے ۶۰۰ فٹ نیچے تین ہزار سال پرانے اس شہر کی دریافت ہوئی ہے۔ یہ بدنصیب شہر پہلے کبھی جزیرہ ہوا کرتا تھا جب اس پر ایک باقاعدہ انسانی شہر آباد تھا۔ پھر برف کے بتدریج پگھلنے سے سمندر کی سطح بڑھنے لگی

یہاں تک کہ شہر پناہ (Aztecs) سمندر کے ۶۰۰ فٹ نیچے چلا گیا۔ زیر آب کھدائی کے بعد قدیم انسانی تہذیب کی بہت سی نشانیاں ملی ہیں۔ ایسے ہی ایک شہر کی دریافت ممبئی کے ساحل کے قریب بھی ہو چکی ہے۔
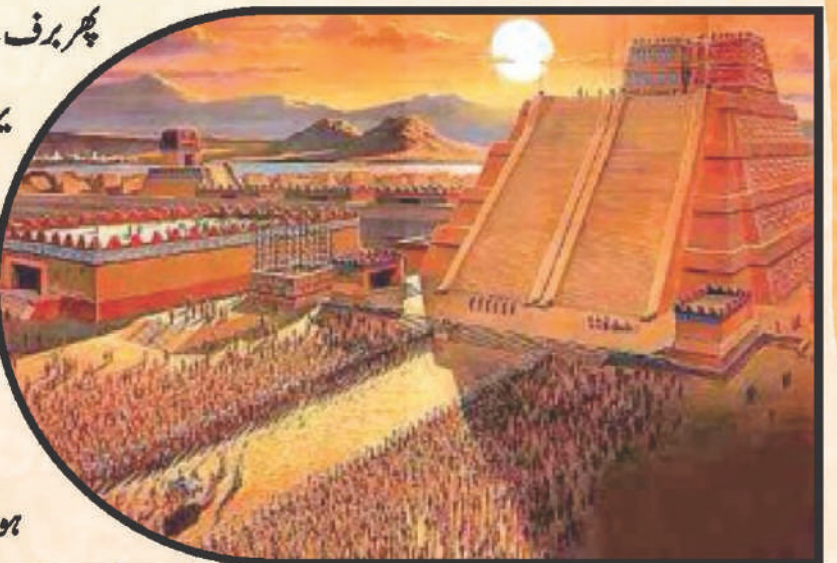
گرینڈ جامع مسجد......بحریہ ٹاؤن

گرینڈ جامع مسجد، بحریہ ٹاؤن، لاہور پاکستان کی تیسری سب سے بڑی مسجد ہے۔ ۵ دسمبر ۲۰۱۴ء کو باقاعدہ جمعے کی نماز سے مسجد عوام کے لیے کھول دی گئی۔ اس کے اندرونی حصے میں ۲۵،۰۰۰ نمازی جبکہ صحن اور مرکزی ہال کے دالان کو ملا کر کل ۷۰،۰۰۰ نمازی ایک وقت میں نماز ادا کر سکتے ہیں۔ اس کا فنِ تعمیر بادشاہی مسجد، مسجد وزیر خان اور شیخ زید مسجد سے متاثر ہے۔ اس کی تعمیر میں ۴ بلین سے زائد پاکستانی رقم حرچ ہوئی ہے۔ مسجد چار میناروں اور ۲۰ چھوٹے اور ایک بڑے گنبد پر مشتمل ہے، ہر مینار کی اونچائی ۱۶۵ فٹ ہے۔ اس کے علاوہ، مرکزی ہال کو ترکی سے بنوائے گئے قالینوں اور ایران سے منگوائے ۵۰ فانوسوں سے سجایا گیا ہے۔ مسجد میں خواتین کے لیے الگ سے نماز کی جگہ مختص ہے جبکہ ایک اسکول اور اسلامی آرٹ گیلری بھی موجود ہے۔

مرسلہ: کومل فاطمہ اللہ بخش

پنیر کے پکوڑے

اشیا

دودھ (ایک کپ)، پنیر (ایک کپ)، پسے ہوئے بادام (ایک کھانے کا چمچہ)، انڈا (ایک عدد)، نمک (حسب ذائقہ)، لال مرچ پسی ہوئی (ایک چائے کا چمچہ)، ہری دھنیا باریک کٹی ہوئی (دو عدد)، سوکھا دھنیا پسا ہوا (ایک کھانے کا چمچہ)، تیل (فرائی کرنے کے لیے)، ڈبل روٹی کے ٹکڑے (چھ عدد)۔

ترکیب

دودھ میں پنیر، انڈا، نمک، لال مرچ، ہری مرچ، بادام ڈالیں اور خوب ملا کر آمیزہ تیار کر لیں۔ ڈبل روٹی کے ٹکڑے چوکور شکل میں کاٹ لیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کریں۔ اب ایک ایک ٹکڑا لے کر آمیزے میں ڈبوئیں اور فرائی کریں۔ سنہری شکل ہونے پر نکال لیں۔ منفرد پکوڑے تیار ہیں۔ گرما گرم پکوڑے ہری چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

قصہ ایک ورکشاپ کا

رپورٹ: سیدہ منتہیٰ علی، راحت عائشہ

گزشتہ کچھ برسوں کی طرح امسال بھی ساتھی گائیڈنس فورم کے تحت منعقد ہونے والی ورکشاپ برائے قلمکاران اپنی نوعیت اور موضوعات کے تنوع کی وجہ سے کامیاب رہی۔ مورخہ ۱۹، ۲۰ جنوری بروز منگل، بدھ ۲۰۱۶ء کو ساتھی گائیڈنس فورم کی جانب سے 'اسلامک ریسرچ اکیڈمی' میں ورکشاپ برائے قلمکاران' کا انعقاد کیا گیا۔ تلاوت قرآن پاک سے پروگرام کا آغاز کیا گیا۔ پروگرام انچارج اعظم طارق کوہستانی نے شرکا سے مخاطب ہو کر پروگرام کا باقاعدہ آغاز کیا۔ مختصر الفاظ میں ورکشاپ برائے قلمکاران کا تعارف پیش کیا اور ورکشاپ کے بارے میں شرکا کو چند ہدایات دیں۔ پھر شرکا سے ان کا تعارف لیا گیا۔ سب سے پہلے 'اسامہ شفیق' (اسسٹنٹ پروفیسر جامعہ کراچی) کو دعوت دی گئی کہ وہ ادب کے اثرات کے موضوع پر لب کشائی کریں۔ اُسامہ شفیق صاحب نے انسانی زندگی کے آغاز سے لے کر آج کے جدید دور میں موجود ادب کی اہمیت کو کافی تفصیل سے بیان کیا۔ اُنھوں نے بتایا کہ ادب کا آغاز انسانی زندگی کے آغاز کے ساتھ ہوا۔ جس نے انسان کو اس کا علم اور مشاہدہ فراہم کیا۔ انسان نے اپنے ارتقا کا سفر شروع کیا اور آئندہ آنے والی نسلوں کی رہنمائی کی۔ مزید یہ کہ انسان کا علم اور اس کا مشاہدہ دو اہم بنیادی چیزیں ہیں جو انسان کو اس کی زندگی گزارنے کا طریقہ سکھاتی ہیں کہ اس نے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ انسان کی زندگی اس کے مشاہدے کے گرد گھومتی ہے اور اسی مشاہدے سے وہ اپنی زندگی کے رخ کا تعین کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ بچوں کا ادب تخلیق کرنا دنیا کا سب سے مشکل ترین کام ہے۔ ہم چھوٹے بچوں سے کوئی سوالنامہ تیار نہیں کروا سکتے۔ ہمیں ان کی ترجیحات کو اپنے مشاہدے سے سمجھنا ہے کہ وہ کیا پسند کرتے ہیں اور کیا نہیں۔ اُنھوں نے مزید بتایا کہ ادب کے بغیر انسانی زندگی کی بقا ناممکن ہے۔ اچھا قلمکار وہ ہے جو پڑھنے والے کے ساتھ بہتے ہوئے اس کو اپنی سمت میں لے آئے اور اسی دوران غیر محسوس انداز میں اس تک پیغام پہنچا دے۔ غرض کہ اسامہ شفیق صاحب نے اپنے موضوع سے پورا پورا انصاف کیا۔

اس کے بعد سابق مدیر ساتھی میر شاہد حسین صاحب نے 'مضمون کیسے لکھیں؟' جیسے خشک موضوع کو اپنی لطیف طبیعت کے باعث بہت دلچسپ انداز میں پیش کیا۔ اُنھوں نے مضمون اور کہانی کے فرق کو بریانی اور سادہ چاولوں کے درمیان سادہ سی مثال سے واضح کیا۔ جس سے ہماری بھوک چمک اُٹھی اور ہمیں یاد آیا کہ صبح ورکشاپ میں آنے کی خوشی میں ہم ناشتہ کرنا بھول گئے تھے خیر بھوک کو تھپک کر ہم مضمون پر آ گئے۔ اُنھوں نے کہا کہ بھوک تو سادہ چاول سے بھی مٹ جاتی ہے مگر تسکین اور مزہ بریانی سے ہی ملتا ہے تو اسی طرح مضمون سادہ ہوتے ہیں اور کہانی میں دلچسپی کا سامان زیادہ ہوتا ہے۔ بچوں کے لیے لکھتے وقت لکھاری مضمون میں کہانی کا عنصر ڈالتے ہیں تا کہ بچوں کی دلچسپی برقرار رہے۔ انھوں نے پروجیکٹر کی مدد سے مضمون کی تیاری کے سلسلے میں پیش آنے والے نکات پر بڑی وضاحت سے مثالیں دے کر روشنی ڈالی۔ ان کے نزدیک مضمون کی تیاری میں معلومات کو بہت اہمیت حاصل

ہے اس لیے معلومات کا حوالہ دینا کہ وہ کس قدر مستند ہیں بہت ضروری ہے۔ آخر میں اُنھوں نے کہا کہ ادیب کا کام ہے کہ وہ جس قسم کا بھی مضمون لکھے اس میں اُمید کی کرن پیدا کرے اور اس کو بچوں کی پسند کے مطابق تشکیل دے۔

اس کے بعد نجیب احمد حنفی کو دعوت دی گئی کہ وہ 'کہانی کیوں لکھیں؟' پر اظہار خیال کریں جس کا آغاز اُنھوں نے جس انداز سے کیا وہ ہمارے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ انھوں نے ڈائس پر آتے ہی سامنے بیٹھے ایک صاحب سے سو روپے کا مطالبہ کر دیا جس پر ایک لمحے کو تو وہ صاحب گڑبڑا گئے اور حیران و پریشان نجیب صاحب کی شکل تکنے لگے۔ پھر نجیب صاحب کے دوبارہ متوجہ کرنے پر اُنھوں نے پورا بٹوہ ہی ان کے سامنے پیش کر دیا جس میں سے نجیب صاحب نے کمال بے نیازی سے سو روپے نکال لیے۔ پھر گویا ہوئے کہ چاکلیٹ کس کس کو پسند ہے؟ اب بھلا ایسا کون شخص ہوگا جس کو چاکلیٹ پسند نہ ہو مگر شرم و حضوری میں سوائے ایک صاحب کے کسی نے ہاتھ بلند نہ کیا ان صاحب سے ان کی پسند پوچھی گئی جس کا جواب آئسکریم کی صورت میں آیا۔ اب آپ ہماری بھوک کا حال سوچ سکتے ہیں۔ جس پر نجیب صاحب نے ان کو وہی سو روپے پکڑائے اور کہا کہ جائیں آئسکریم کھا کر آ جائیں۔ اب وہ صاحب یہ سوچنے میں مگن ہوئے کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ کیا یہاں فرمائشی پروگرام چل رہا ہے، خیر ان صاحب نے گڑبڑاتے ہوئے پیسے لینے سے انکار کر دیا کہ میں بعد میں کھا لوں گا۔ نجیب صاحب اشتیاق احمد بننے کے موڈ میں تھے۔ ہمارا تجسس آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ بالآخر وہ اپنے اصل موضوع کی طرف آئے اور کہا کہ جس طرح یہاں سب اس ورکشاپ میں سیکھنے اور سمجھنے کے مقصد سے موجود ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنے شوق کی قربانی دے رہے ہیں اس طرح انسان کو بھی اس دنیا میں ایک مقصد کے لیے بھیجا گیا ہے اور وہ ہے عبادت۔ انسان کی ہر چیز عبادت کے زمرے میں آ سکتی ہے اگر وہ اس سے پہلے نیت کرے کہ یہ کام میں اللہ کے لیے کر رہا ہوں۔ لکھنا بھی عبادت ہے۔ پندرہ منٹ کی اس مختصر، دلچسپ اور زبردست اُتار چڑھاؤ والی گفتگو کا اختتام اُنھوں نے اس شعر سے کیا کہ

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

اس کے بعد کھانے اور نماز کا وقفہ دیا گیا جس میں سب نے دوسرے سے تعلقات بڑھائے اور بریانی سے بھرپور انصاف کیا۔

وقفہ کے بعد کہانی لکھنے کے موضوع پر سابق مدیر ساتھی صہیب جمال صاحب کو دعوت دی گئی جس کی شروعات انھوں نے یہ کہہ کر کی کہ مجھے لکھنے لکھانے سے کوئی شغف نہیں تھا لیکن حالات و واقعات نے میرے اندر چھپے لکھاری کی صلاحیت کو روشناس کرایا۔ اُنھوں نے کہانی میں منفرد اور نئے خیال پر زور دیا۔ آپ نے کہا کہ مختصر لکھیں، مختصر بات کریں اور اپنا پیغام پہنچائیں۔ اُنھوں نے کہا کہ کہانی کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں بلا کا تجسس ہو جو قاری کو متوجہ کرلے اور قاری سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ اب کیا ہوگا؟ وہ کہانی ضرور پڑھے گا جس سے آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لکھنے والا جس سوچ و فکر

کا مالک ہوگا وہی اس کے قلم سے جھلکے گا۔ ان کی باتوں میں حقیقت اور سچائی کے رنگ بھی تھے اور مستقبل کے خواب اور ویژن بھی۔

ان کی کہانی سننے کے بعد مشہور و معروف شاعر اجمل سراج صاحب نظم کے متعلق رہنمائی کرنے کے لیے تشریف لائے۔ اُنھوں نے کہا شاعری ایک خداداد صلاحیت ہے یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ پھر اُنھوں نے ساتھی کے لیے بھیجی جانے والی مختلف نظموں میں موجود غلطیوں کی نشاندہی کر کے درست اور باوزن شعر لکھنے کا طریقہ بتایا۔ انھوں نے کہا نظم میں وزن برقرار رکھنے کے لیے اس کے اشعار میں مناسب ردیف استعمال کرنا بہت ضروری ہے۔ مزید یہ کہ نظم میں صرف ایک موضوع کو لے کر چلنا ہوتا ہے۔ اُنھوں نے سامعین کی فرمائش پر آزاد نظم کو بھی تفصیل سے بیان کیا کہ آزاد نظم وہ ہوتی ہے جس میں ردیف استعمال نہیں کیا جاتا مگر اس میں بھی الفاظ کو ایسے انداز سے لے کر چلنا پڑتا ہے کہ نظم کا تاثر قائم رہے۔ گو کہ اُنھوں نے بہت پُر اثر اور زبردست انداز میں نظم لکھنے کا طریقہ اور اس کا انداز بیان کیا جس نے صحیح معنوں میں سامعین کی کافی رہنمائی کی۔

پھر ساتھی کے ساتھیوں کی مزید رہنمائی کے لیے مدیر ذوق و شوق عبدالعزیز صاحب کو دعوت دی گئی کہ وہ سامعین کو پروف ریڈنگ (حروف خوانی) کے بارے میں تفصیلی لیکچر دیں تاکہ ساتھی اپنی کہانیوں کو اتنا تیار کر کے بھیجیں کہ مجلس ادارت کو ان کی کہانی کمپوز کرنے میں تھوڑی آسانی ہو جائے۔ اُنھوں نے کہا کہ کہانی لکھ کر باقی کا سارا کام ادارت پر نہ ڈالیں کہ کہانی کے لوازمات ساتھی والے پورا کریں۔ اُنھوں نے اردو زبان کے مختلف الفاظ کا صحیح تلفظ اور اُنھیں درست انداز میں لکھنے کا طریقہ بتایا جسے سن اور دیکھ کر ہمارے ہاتھوں کے توتے کبوتر کوے سب اڑ گئے کہ یاخدا آج تک ہم اُردو کی کتنی ٹانگیں توڑ چکے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ورکشاپ کا بہترین دن اپنے اختتام کو پہنچا۔

دوسرے دن کا آغاز تلاوت قرآن پاک کے بعد نعت رسول مقبولؐ سے کیا گیا جو کہ معروف ڈرامہ نگار عمران نرمی صاحب کی آزاد نظم تھی جسے اُنھوں نے خود پڑھ کر سنایا جس سے ماحول میں ایک سماں سا بندھ گیا۔ اس کے بعد عمران نرمی صاحب کو ہی دعوت دی گئی کہ وہ ڈراما اور اسکرپٹ رائٹنگ کے موضوع پر سامعین کی رہنمائی کریں۔ اُنھوں نے اپنی بات کا آغاز اس نکتے سے کیا کہ ہر لکھی ہوئی چیز اسکرپٹ ہے جس کا بنیادی کام ہے کسی سے رابطہ کرنا اور اس تک اپنا پیغام پہنچانا، ایک اچھا رائٹر وہ ہے جو قاری تک اپنا پیغام بخوبی پہنچا سکے۔ مزید یہ کہ ڈراما بھی ایک اسکرپٹ ہوتا ہے جو لکھے جانے کے بعد اسکرین پر چلتا ہے۔ اُنھوں نے ڈراما لکھنے کا طریقہ بتایا۔ مزید یہ کہ جس کی حقیقی زندگی میں جتنا ڈراما ہوگا وہ اتنا ہی اچھا ڈرامہ لکھ سکے گا۔ (اس سے ہمیں خیال آیا کہ ہم پڑھائی پر ایک آدھ درجن ڈرامے تو لکھ ہی سکتے ہیں کہ اس سے متعلق بہت سے ڈرامے ہمارے ساتھ پیش آچکے ہیں)۔ اُنھوں نے ایک اہم بات یہ بتائی کہ ڈرامے میں ایکشن (عمل) زیادہ سے زیادہ ہو جو دیکھنے والے کو چونکائے کہ سوال پیدا ہو آگے کیا ہوگا جس سے دلچسپی برقرار رہے۔ اس کے بعد اُنھوں نے

ڈرامے میں اسکرپٹ رائٹنگ کے تین اہم مراحل بتائے جو کسی ڈرامے کو تخلیق کرتے ہیں۔ پہلا اور سب سے اہم شعبہ کردار سازی کا ہوتا ہے جس میں کردار تخلیق کیا جاتا ہے ۔دوسرا یہ کہ مکالمہ نگاری پر بھرپور توجہ دی جائے۔ مکالمے اتنے جاندار ہوں کہ انہی کے ذریعے پوری کہانی بیان کی جائے جو ڈرامے میں جان ڈالتی ہے۔ تیسری اہم بات یہ کہ منظر نگاری بھرپور طریقے سے کی جائے تاکہ جب اسے اسکرین پر چلایا جائے تو تمام مناظر مکمل انداز سے دکھائے جاسکیں جو ڈرامے میں رنگ بھردیں۔ غرض کہ عمران نرمی صاحب نے کافی تفصیل سے ڈراما رائٹنگ کا خاکہ بیان کیا جسے سن کر ہمیں ایسا محسوس ہونے لگا کہ بس اب تو ہم ایک آدھ ڈراما لکھ ہی ڈالیں گے۔

اب سابق مدیر آنکھ مچولی سلیم مغل صاحب کی تشریف آوری ہوئی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سلیم صاحب کے بولنے کے انداز میں ایسی کوئی خاص کشش ہے کہ سننے والا بہت دلچسپی محسوس کرتا ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ آپ کہانی میں وہ آئیڈیاز لائیں جو نئے ہوں، جو پڑھنے والے کی توجہ کھینچیں۔ اُنھوں نے کہا کہ بچوں کو خاص کر وہ چیزیں زیادہ پرکشش محسوس ہوتی ہیں جن کا وجود نہ ہو مثلاً بھوت، جنات وغیرہ اور پچھلے ادوار میں ان سے متعلق بہت سی کہانیاں لکھی اور پڑھی گئی ہیں۔ اُنھوں نے بتایا کہ کہانی ایک فطری تقاضا ہے اور اس میں آپ نے نیا موضوع یا نیا کردار داخل کرنا ہے۔ اُنھوں نے اہم بات یہ بتائی کہ کہانی بڑی ایجاد کی پہلی سیڑھی ہے یعنی پہلے چیزوں کو سوچا گیا ان پر کہانیاں بنائی گئیں اور پھر وہ وجود میں آئیں۔ انھوں نے کہا کہ بچوں کے لیے لکھنا بچوں کا کھیل نہیں۔ چوٹی کے فنکاروں نے بھی بچوں کے لیے لکھنے سے صاف انکار کردیا کہ وہ لکھنے سے قاصر ہیں۔ اُنھوں نے بچوں کے لیے نہ لکھنے والوں کے ادب کے لیے بلیک لٹریچر کی اصطلاح بھی استعمال کی۔

اس کے بعد پی ٹی وی کے پروڈیوسر غلام مصطفیٰ سولنگی صاحب تشریف لائے جن کا موضوع تھا اردو ڈاکومنٹری اور فیچر رائٹنگ۔ اُنھوں نے اپنے لیکچر کا آغاز ڈاکومنٹری اور فیچر رائٹنگ کی قدیم تاریخ سے کیا کہ تقریباً ہر دور میں ان دونوں چیزوں کو اہمیت حاصل رہی ہے۔ اُنھوں نے بتایا کہ ڈاکومنٹری ایسی مستند چیز کو کہتے ہیں جو خود تحقیق کر کے بنائی جائے جس میں پیش کی جانے والی چیز کے بارے میں مکمل اور مستند معلومات ہوں۔ فیچر لکھی ہوئی اس خاص چیز کو کہتے ہیں جو مضمون کی صورت میں لکھا جائے۔ جس میں کسی واقعہ کو بیان کیا جائے۔ آپ کے پاس جس قدر معلومات اور مشاہدہ ہوگا آپ کا فیچر یا ڈاکومنٹری اتنی اچھی ہوگی۔

نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ نماز اور کھانے کا وقفہ دیا گیا جس سے فارغ ہو کر ساتھی کے سینئر رائٹرز کے ساتھ ایک نشست تھی جس کا ہمیں پوری ورکشاپ میں سب سے زیادہ انتظار تھا۔ بالآخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ اُمّ ایمان، حماد ظہیر اور الیاس نواز شرکا کے سامنے جلوہ افروز ہوئے۔ سب سے پہلے اُمّ ایمان صاحبہ نے بتایا کہ آپ چاہے کم لکھیں، چھوٹا لکھیں مگر پراثر لکھیں۔ ایسا کہ آپ اس چھوٹے سے مسودے میں اپنا پیغام دے دیں۔ انھوں نے کہا کہ جیسے

ہی آپ کے دماغ میں کوئی آئیڈیا آئے اسے کہیں لکھ کر رکھ لیں اور جب دماغ میں آئیڈیاز کا ریلہ بہہ رہا ہو تو بس لکھنے بیٹھ جائیں اور لکھتے چلے جائیں۔ جب آپ کا دل جو لکھنے کو چاہے آپ اس وقت وہی چیز لکھیں۔ اس کے بعد حماد ظہیر نے ہمیں بتایا کہ آپ کو لکھنے کے لیے دو چیزیں چاہییے ایک قلم اور ایک کاغذ باقی رہے آئیڈیاز تو اگر آپ تخلیق کار ہیں تو آپ کو چلتے پھرتے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہی کافی آئیڈیاز مل جائیں گے۔ انھوں نے اپنے ساتھ پیش آنے والے بہت سے واقعات کی مثالیں دیتے ہوئے کہا کہ ان پر کوئی نہ کوئی کہانی بخوبی لکھی جاسکتی ہے۔ اُنھوں نے مزید بتایا کہ کہانی کے موضوعات تو پرانے ہی ہوتے ہیں بس لکھنے والے کا کام ہے کہ اس کے انداز کو بدل دے جو قاری کی توجہ کا مرکز بنے۔ چٹ پٹی کہانیاں لکھنے والے الیاس نواز صاحب بظاہر بہت سنجیدہ مزاج تھے۔ سب سے مزے کی بات جو پتا لگی وہ یہ تھی کہ جنات کی باتیں سچی کہانی تھی حتیٰ کہ کرداروں کے نام تک سچ تھے بس اسے تھوڑا مسالا لگا دیا گیا تھا۔ اُنھوں نے کہا کہ آپ کو کوئی آئیڈیا یا کہانی نہیں ملتی تو اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں ماریں کچھ نہ کچھ تو مل ہی جائے گا۔ اس دوران سوالات و جوابات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ایک اہم بات یہ بھی زیر بحث رہی کہ کچھ لوگ جو بڑی اور طویل کہانی لکھتے ہیں وہ کہانی کو اتنا ہی طول دیں جو اس کے مزاج کو خراب نہ کرے اور جو چھوٹا اور کم لکھتے ہیں وہ اتنا بھی کم نہ کریں کہ کہانی کا پیغام قاری تک نہ پہنچ سکے۔

اس کے بعد مدیر ساتھی فصیح اللہ حسینی صاحب نے کچھ مثالیں اور کچھ عجیب وغریب سوال کر کے انسان کے اس کے رب اور قرآن پاک سے رشتے کو بیان کیا جیسے ہم ایک یہودی کی فیس بک کو اپنی زندگی کا اتنا قیمتی وقت دیتے ہیں کیا اتنا ہی وقت ہم قرآن پاک کو دیتے ہیں، انھوں نے یہ بھی بتایا کہ کہانی وہ ذریعہ ہے جو رابطے کے لیے کام آتی ہے اور اس کے ذریعہ اپنا پیغام بھی پہنچایا جاتا ہے۔ جس میں لکھاری کا کوئی مفاد نہیں ہوتا۔ بس معاشرے کی بھلائی کے لیے یہ کام کیا جاتا ہے۔ ان کی یہ چھوٹی سی نشست دلچسپی سے بھرپور اور بہت پر اثر ثابت ہوئی۔

سب سے آخر میں شفیق صورت، نورانی سا چہرہ لیے ایڈیٹر روزنامہ جسارت اطہر ہاشمی صاحب تشریف لائے جنھیں آپ ہر ماہ ساتھی کا پوسٹ مارٹم کرنے سے بخوبی جانتے ہوں گے۔ ان کی گفتگو نے محفل کو زعفران زار بنا دیا۔ اُنھوں نے اِملا درست کرنے کے طریقے بتائے اور کافی اردو کی غلطیوں کی نشاندہی کی۔ ہمارے بہت سارے سوالات کے جوابات دیئے اور ہمیں تاکید کی کہ ہم اپنا لغت سے بہت اچھا تعلق بنائیں۔

آخر میں پورے دو دن شرکت کرنے والوں میں انعامات اور اسناد تقسیم کی گئیں اور جو صرف ایک دن آئے ان کے اصرار پر اکیڈمی اور ساتھی والوں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کر کے ان میں بھی انعامات تقسیم کیے۔ انعام میں دی گئی کتابوں نے گویا دل جیت لیا کہ وہ نہایت معلومات افزا اور شاندار تھیں اور اس طرح یہ پر رونق اور بہترین تقریب اپنے اختتام کو پہنچی۔

☆......☆

ساتھیو! ہو جائیں تیار...... کیوں کہ ساتھی ایک بار پھر لایا...... ایک نیا اور انوکھا انعامی سلسلہ...... تاریخ کی سیر کیجیے...... مسلم حکمرانوں، سیاست دانوں، سائنس دانوں اور ان شخصیات سے ملیے جنھوں نے تاریخ کا دھارا بدل کر رکھ دیا...... بذریعہ قرعہ اندازی جیتنے والے ساتھیوں کو **اکیڈمی بک سینٹر** کی جانب سے دی جائیں گی ڈھیر ساری کتابیں اور تاریخی سی ڈیز...... تو پھر تیار ہیں ناں آپ...... تاریخ کی کھوج کے لیے......!!

موجودہ بھارت کے صوبے اتر پردیش کے ضلع رائے بریلی میں آپ کی ولادت ہوئی۔ بچپن سے ہی گھڑ سواری، مردانہ اور سپاہیانہ کھیلوں میں دلچسپی تھی۔ کبڈی بہت شوق سے کھیلتے تھے۔ خدمتِ خلق کا ذوق رکھتے اور گاؤں کے گھر گھر جا کر ضروریاتِ زندگی کا معلوم کرتے اور جہاں جس چیز کی ضرورت ہوتی لا کر دیتے۔ بچپن سے ہی سخت جسمانی ورزشیں کرنے کے عادی تھے۔ والد کے انتقال کے بعد معاش کی غرض سے لکھنؤ کا سفر کیا۔ چار ماہ تک معاش کا مسئلہ حل نہ ہوا تو اپنے دوستوں سے دہلی شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں چلنے کو کہا۔ دوست تیار نہ ہوئے تو آپ اکیلے ہی پیدل لکھنؤ سے دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔ دہلی پہنچ کر شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے آپ کو اپنے ایک ملازم کے ساتھ شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ کے پاس بھیجا۔ چنانچہ آپ شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ کے پاس رہنے لگے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ کی صحبت سے خیالات میں انقلاب آیا۔ آپ شاہ ولی اللہؒ کی تحریک کو لے کر آگے بڑھے۔ یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت فنا ہو رہی تھی۔ مشرکانہ رسمیں اور بدعتیں اسلامی معاشرے میں زور پکڑ رہی تھیں۔ پنجاب پر سکھ اور باقی ماندہ ہندوستان پر انگریز قابض ہو چکے تھے۔ غلامی کے سائے دراز ہوتے چلے جا رہے تھے۔ امتِ مسلمہ اپنی اساس کھو چکی تھی۔ ایسے میں سادات خاندان کے اس چشم و چراغ نے اسلام کے پرچم تلے فرزندانِ توحید کو جمع کرنا شروع کیا اور جہاد کی صدا بلند کی۔ اس کے نتیجے میں مجاہدین کی ایک جماعت وجود میں آئی۔ بعض سیاسی اور فوجی مصلحتوں کی بنا پر آپ نے اپنی تحریک کا آغاز ہندوستان کی شمال مغربی سرحد سے کیا۔ سکھوں سے جنگ کر کے مفتوحہ علاقوں میں اسلامی قوانین کا نفاذ کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے مسلمانوں میں موجود شرکیہ عقائد اور بدعات کی اصلاح بھی کی۔ آپ کی تحریک میں علما کی ایک کثیر تعداد آپ کے ہم رکاب تھی۔ تقریباً سترہ برس تک برِّصغیر کے طول و عرض میں پھیلی امتِ مسلمہ کی دم توڑتی ہوئی زندگی میں آپ روح پھونکتے رہے۔ آپ کی شب و روز کی اَن تھک جدّ و جہد کے بعد زُہد و تقویٰ، صدق و اخلاص اور قربانی و ایثار کے ایسے پیکر تیار ہوئے جن کی نظیر صحابۂ کرام کے بعد بہت کم ملتی ہے۔

آپ نے پہلے نواب امیر خان کو مسلمانوں کی حمایت و دفاع پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کیونکہ اس ماحول میں جہاں ہر طرف

تاریکی تھی صرف وہی اُمید کی کرن اور اُبھرتی ہوئی قوت تھے لیکن جلد ہی انگریزوں نے اُن کو رام کرلیا۔ آپ اُس لشکر سے نکلے اور مسلمانوں کے سرنگوں ہوتے پرچم کو خود سربلند کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہاں سے آپ شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے اور جانشین کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جب آپ وہاں حاضر ہوئے تو تنہا تھے۔ شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے کے آستانے پر بڑے بڑے علما ، صلحاء، مشائخ اور سلطنت کے اکابر اپنی حاضری کو اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھتے تھے۔ آپ اپنے خانوادے کی عظیم روایات کے امین، حافظِ قرآن وحدیث اپنے خاندان کے بزرگوں سے اس لحاظ سے ممتاز مقام رکھتے تھے کہ آپ کے بزرگوں کا دائرۂ عمل مدرسہ وخانقاہ میں بیٹھ کر قرآن وحدیث کی تدریس اور تصنیف وتالیف تک محدود تھا۔ آپ اس دائرے سے باہر نکلے اور ہر اُس مقام پر پہنچے جہاں کتاب وسنت کی تعلیمات اجنبی تھیں۔ آپ شروع سے لے کر آخری سانس تک سید صاحب کے شانہ بشانہ رہے۔ زیادہ تر جنگی منصوبے آپ کے ذہنِ رسا کا شاہکار ہوتے۔ آپ سید صاحب کی جماعت کا دماغ بھی تھے اور سپہ سالار بھی۔ اپنوں کی بے وفائی اور غیروں کی سازشوں سے کشمیر کے ایک میدان میں دریا کے کنارے آپ دونوں اصحاب لڑتے لڑتے شہید گئے۔ دیگر رفقا بھی شہادت کے مرتبے پر فائز ہوئے۔ سید صاحب کے بعد بھی آپ کی تحریک چلتی رہی۔

سوالات: ۱) مذکورہ دونوں اصحاب کے نام کیا ہیں؟

۲) اوّل الذکر سید صاحب کی تاریخِ پیدائش کیا ہے؟

۳) تحریک کا مقصد اور نام کیا ہے؟

۴) آپ دونوں اصحاب کب اور کس میدان میں شہید ہوئے؟

کوپن تاریخ کی کھوج (۵)

نام ______________________

کلاس ____________ فون ____________

پتہ ______________________

____

ای میل ______________________

ہدایات

☆...... پچھلے صفحہ پر دیئے گے کوپن کو احتیاط سے پر کریں۔

☆...... نیچے دیئے گے کوپن میں جوابات درست نمبر کے ساتھ لکھیں۔

☆...... کوپن کو ہر ماہ کی 30 تاریخ تک ساتھی کے مندرجہ ذیل پتے پر روانہ کریں۔

☆...... کوپن میں اپنا فون نمبر لازمی درج کریں۔

☆...... جو قارئین انعامی سلسلہ میں بذریعہ ای میل شریک ہونا چاہتے ہیں وہ کوپن کو اسکین کر کے ہمیں روانہ کر سکتے ہیں

پتا: F-206 سلیم ایونیو، بلاک 13-B گلشن اقبال، کراچی۔فون:021-4976468

ای میل:monthlysathee@hotmail.com

جوابات

۱ ____________________

۲ ____________________

۳ ____________________

۴ ____________________

تاریخ کی کھوج

سلسلہ نمبر۳

درست جوابات

۱.....فلسطین

۲.....یہودی، بنی اسرائیل

۳.....صلیبی جنگیں

۴.....قبلہ اوّل بیت المقدس کی موجودگی

۵.....آزادی کا اعلان کرنے والے راہ نما یاسر عرفات تھے جبکہ ۲۰۰۴ء میں شہید ہونے والے حماس کے سربراہ شیخ احمد یاسین تھے

بذریعہ قرعہ اندازی پانچ درست جوابات دینے والے انعام یافتگان

۱۔فہیم احمد (کراچی)

۲۔حافظ محمد طلحہ بن محمد صادق (کراچی)

۳۔نادیہ حسن (ایبٹ آباد)

۴۔نبیل اختر (شارجہ)

۵۔لائبہ ناز (کراچی)

ان ساتھیوں نے بھی اچھی کوشش کی:

عمار احمد (سکھر)، فائزہ شیخ (کراچی)، عارف اللہ (کراچی)، مجتبیٰ احمد (سکھر)، بتول فاطمہ (شیخوپورہ)، عزیز اللہ (پشاور)، معاذ احمد (کراچی)، طفیل محمد (راولپنڈی)، عاصم ممتاز (کراچی)، راشد علی (اسلام آباد)، وقار عزیز (لاہور)، شمس الحق (راولپنڈی)، افشاں نوید (سکھر)، سلطانہ خان (اٹک)، باقر رضا (جھنگ)، حیدر مصطفیٰ (فیصل آباد)، امجد بھٹی (لاہور)، صائمہ فاروق (سیالکوٹ)، حسنین شاہ (کوئٹہ)، عاطف حماد (کراچی)، اسد اللہ (سیالکوٹ)، سعد حسن (لاہور)، سعد ارشاد (حیدرآباد)، عزیزہ فاروق (کراچی)، حرا سمیع (لاہور)، حنا فیض (لاہور)، رابعہ وسیم (حیدرآباد)، رمیل حسن (کراچی)، شمائلہ حسین (کوٹری)، ریحان

صابر (کراچی)، احسن عاصم (کراچی)، عظمیٰ آفریدی (کراچی)، دانش ذوالفقار (کراچی)، عالیہ اکبر (سکھر)، سمیعہ پرویز (کراچی)، شہروز خان (نصیر آباد)، باقر حسین (بلوچستان)، اقراء شکیل (کراچی)، فرخ احمد (کراچی)، عبدالرافع فاروقی (کراچی)، مریم عباسی (کراچی)، مظہر علی (بلوچستان)، حافظ عبدالعزیز (کراچی)، محمد عبدالعزیز (کراچی)، منیف انور (پشاور)، حسن عابد (کراچی)، راشد ملک (کراچی)، صہیب رشید (گوجرانوالہ)، عریش الدین (کراچی)، علی انوار (کراچی)، کومل خالد (کراچی)، ام حبیبہ (کراچی)، عماد عزیز (کراچی)، کامل زبیر (روہڑی)، زوہیب اشفاق (کراچی)، یسریٰ جاوید (کراچی)، کامران حسن (نصیر آباد)، شماس انصاری (کراچی)، بلال نسیم (کراچی)، مریم رفیع (کراچی)، روہیل ابڑو (خیر پور)، نبیل امتیاز (کراچی)، جویریہ سعید (سکھر)، عبدالرشید مینگل (بلوچستان)، اورنگ زیب مینگل (بلوچستان)، حمزہ تحسین (کراچی)، عبدالباسط زہری (نصیر آباد)، محمد ابراہیم (ڈیرہ مراد جمالی) تنزیل الرحمٰن (کراچی)، حذیفہ رضوان اللہ (کراچی)، عبدالجبار (بلوچستان)، محمد عیان (کراچی)، ناصرہ اکرام (کراچی)، رامین طیبہ (کراچی)، ثناء اللہ میرالی (نصیر آباد)، گل حسن (نصیر آباد)، زیب علی (کراچی)، حمدیٰ سعیب (کراچی)، عثمان سعید (کراچی)، حشمت علی (بلوچستان)، شرجیل مشتاق (کراچی)، چاکر خان (کراچی)، بلال لطیف (کراچی)، نور العلمہ (کراچی)، محمد اذہان (کراچی)، عمار اقبال (شارجہ)، محمد ابراہیم خان (کوٹری)، کومل فاطمہ اللہ بخش (کراچی)، علی منور (لاہور)، عارفہ شیخ (حیدرآباد)، یمنیٰ سیف اللہ (کراچی)، حسن شفیق (کراچی)، علی شیر (کراچی)، محمد مصطفیٰ نور محمد فیصل (کراچی)، مرزا حمزہ بیگ (حیدرآباد)، لبیبہ شفیق (کراچی)، توفیق الرحمٰن شفیق (کراچی)، ثمینہ (کراچی)، انیلا اسلم (کراچی)، کلثوم اسلم (کراچی)، فہمیدہ (کراچی)، ثمینہ (کراچی)، رحیم ولی محمد (کراچی)، کرن (کراچی)، یاسمین احمد (کراچی)، سلیم (کراچی)، سلمان حسین (کراچی)، کامران عبدالغفور (کراچی)، مہر نساء (کراچی)، سیما (کراچی)، عبدالرزاق محمد ابراہیم (کراچی)، مسکان لیاقت علی (کراچی)، کومل بنتِ محمد فاضل (کراچی)، گلناز (کراچی)، مصباح (کراچی)، اقراء علی محمد (کراچی) اقراء احمد (کراچی)، عرفان مجید (کوئٹہ)، اسلم خان (پشاور)، فرزانہ عرفان (لورالائی)، نجیب خان (اسلام آباد)، وقار صہیب (سکھر)

خواہش کی قیمت

روبنسن سیموئیل گل

"یار، کاش صبح ہڑتال ہوجائے، کرفیو لگ جائے، سیلاب آجائے، حکومت ختم ہوجائے، اسمبلیاں ٹوٹ جائیں...... جنگ شروع ہوجائے۔"

"کیا بکواس کررہے ہو یار، مُنھ اچھا نہیں تو کم از کم بات ہی اچھی کرلیا کرو۔" کاشف نے سہیل کو ٹوکتے ہوئے کہا۔

"اور کیا کہوں یار، صبح کیمسٹری کا پرچہ ہے بالکل بھی تیاری نہیں، بس بورڈ والے ایک چھٹی دے دیتے تو مَیں تیاری کرلیتا۔"

"یار پورا سال تو تُم گھومتے پھرتے رہے اور اَب ایک دن میں کیا خاک تیاری کرنا تھی۔ ویسے اَب بھی موقع ہے، رات بھر تیاری کرلو تو صبح کم از کم پاسنگ مارکس ہی آجائیں گے۔"

"یار تمھارے سامنے کوشش تو کررہا ہوں پڑھنے کی

لیکن کیا کروں پڑھا ہی نہیں جا رہا؟''
''تُم کوشش تو کرو مگر ایسی اُلٹی سیدھی خواہش نہ کرو۔ بھلا تمھاری خواہش سے کیمسٹری کا پرچہ تو ملتوی نہیں ہو جائے گے ناں۔''
کالج کے ہاسٹل میں خوب پڑھائی جاری تھی کیوں کہ ایف ایس سی کے بورڈ کے امتحانات ہو رہے تھے۔ کاشف اور سہیل ہاسٹل میں ہم کمرہ تھے۔ دونوں کے مضامین بھی ایک ہی تھے۔ کاشف محنتی تھا جبکہ سہیل کچھ لاپرواواقع ہوا تھا، موڈ ہوتا تو پڑھ لیتا ورنہ گھومنے پھرنے اور کھانے پینے میں وقت گزار دیتا۔ وقت بے وقت کھاتے رہنے کی وجہ سے اُس کا وزن بھی زیادہ تھا اور اُس پر سُستی ہر وقت چھائی رہتی تھی۔
صغیر نے اُن کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا:
''یار مَیں تو مِلک شیک پینے جا رہا ہوں، چلنا ہے؟''
کاشف تو پڑھائی میں اِس قدر مصروف تھا کہ صغیر کی آمد کا اُسے احساس بھی نہ ہوا۔ جبکہ سہیل فوراً کتاب ایک جانب رکھتے ہوئے بولا: ''چل یار مَیں تیرے ساتھ چلتا ہوں کچھ کھائے پیے بغیر مجھ سے پڑھائی نہیں ہونے لگی۔''
دونوں کینٹین پر پہنچے تو صغیر نے مِلک شیک کا آرڈر کیا جبکہ سہیل نے برگر اور پیپسی منگوائی۔
صغیر بولا: ''اور یار، سناؤ کیسی تیاری ہے؟''
سہیل نے برگر کا بڑا سا لقمہ لیتے ہوئے کہا: ''بس یار تمھیں پتا ہی ہے میری تیاری کیسی ہوگی، اَب کوشش تو کر رہا ہوں کہ کچھ پلے پڑ جائے مگر مشکل ہی لگ رہا ہے۔''
'' میری تو اچھی تیاری ہو گئی ہے اور آج رات ایک مرتبہ پھر دہرالوں گا۔'' صغیر نے مِلک شیک کا گھونٹ لیتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا۔
اِسی دوران سراج اور اطہر بھی وہاں آ پہنچے، دونوں کے ہاتھ میں نوٹس تھے۔ سہیل اُنھیں دیکھ کر بولا: ''اوئے کتابی کیڑو کچھ گھوم پھر بھی لیا کرو۔''
اطہر نے برجستہ جواب دیا، ''ارے نظر نہیں آیا گھومنے پھرنے اور کھانے پینے ہی تو نکلے ہیں بلکہ تم ہمیں کچھ کھلاؤ پلاؤ۔''
'' واہ جی واہ، مجھے کیا پڑی ہے کہ تُم پر اپنا قیمتی سرمایہ ضائع کروں۔''
صغیر سہیل کی بات سُن کر ہنس پڑا اور اُن دونوں سے پوچھنے لگا: ''بتاؤ کیا کھاؤ پیو گے؟''
سراج بولا، '' بھئی ہم تو سہیل ہی سے ٹریٹ لیں گے۔''
'' لو بھلا مَیں نے کوئی بورڈ میں ٹاپ کیا ہے جو تُم دونوں کو ٹریٹ دُوں۔''
اطہر اُس کے قریب ہوتے ہوئے بولا: ''ہمارے پاس ایک ایسی خبر ہے جو تمھارے لیے ٹریٹ سے کم نہیں ہوگی۔ سو ایک ٹریٹ ہم دیں گے اور ایک تُم ہمیں

دو۔“

سہیل نے تجسس بھری نگاہوں سے اطہر کی جانب دیکھا اور سوالیہ انداز میں اپنی بھنوؤں کو اُوپر اٹھاتے ہوئے پوچھا، بھئی کیسی ٹریٹ؟“

”پہلے ہم دونوں کو ٹھنڈا مشروب پلاؤ پھر وہ سرپرائز دیں گے۔“

سہیل کو سرپرائز ز ہمیشہ بھاتے تھے وہ فوراً کینٹین والے کی جانب دیکھ کر چلّایا: ”دو پیپسی لانا اُستاد۔“

بنا کسی توقف کے اطہر بھی اُسی لب و لہجے میں چلایا: ”ہاں اور دو برگر بھی اُستاد جی لیتے آنا۔“

”اچھا اَب بتاؤ کیا سرپرائز ہے؟“

”اچھا بتاتے ہیں، بتاتے ہیں، ذرا برگر اور پیپسی تو حلق سے اُتر لینے دو۔“

”ارے مجھے اپنے کمرے میں جا کر صبح کے پیپر کی تیاری بھی کرنی ہے، جلدی بتاؤ آخر ایسی کون سی خوشخبری ہے تمھارے پاس۔“

صغیر ملک شیک کا آخری گھونٹ پی کر ٹشو پیپر سے اپنا مُنھ پونچھتے ہوئے بولا۔

”سہیل یار اُن کو تھوڑا سا کھا پی لینے دو، آخر اتنی بھی بے صبری کیوں؟ چلے جانا تیاری کے لیے ابھی تو ساری رات پڑی ہوئی ہے۔“

سہیل نے تینوں کو مخاطب کر کے کہا: ”دوستو، مَیں تو دُعائیں کر رہا ہوں کہ صبح بس کچھ ایسا ہو جائے کہ کیمسٹری کا پرچہ ملتوی ہو جائے۔“

سراج بولا: ”ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دَم نکلے۔ بھئی ہم تو چاہتے ہیں کہ صبح امتحان دیں اور کیمسٹری سے جان چھوٹے۔ اور تُم اِس منحوس امتحان کو مزید آگے کروانے کی خواہشیں کرتے پھر رہے ہو۔“

”ہائے مَیں تو یہاں تک کہہ رہا ہوں کہ صبح حکومت ہی ٹوٹ جائے، مُلک پہ حملہ ہو جائے یا تیسری عالمی جنگ شروع ہو جائے۔“

اطہر نے پیپسی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا: ”توبہ توبہ کیسی انوکھی دُعائیں مانگ رہے ہو۔ اپنے فائدے کے لیے ایسی خطرناک خواہش کبھی نہیں کرنی چاہیں۔ کیا پتا کون سی گھڑی قبولیت کی ہو؟“

سراج بولا، ”یار برگر بڑا مزے کا ہے، اَب ہم بھی ایک مزے کی خبر سناتے ہیں اور اُمید ہے کہ وہ سُن کر تمھیں کچھ تسلی ہو جائے گی۔“

سہیل بے تابی سے بولا: ”ہاں ہاں، ضرور ضرور۔“

تو اُستاد جی خبر یہ ہے کہ آج رات کیمسٹری کا پرچہ آؤٹ ہونے کا امکان ہے۔ ہمیں خاص ذرائع سے پتا چلا ہے۔“

سہیل مسکرانے لگا اور بولا: ”ارے یار یہ تو بڑی مزے کی اور زبردست خبر سنائی ہے۔ ویسے کتنے چانسز ہیں کہ پیپر آؤٹ ہو جائے گا اور کہیں ایسا تو نہیں ہو گا کہ صبح سوالیہ پیپر بدلا ہو؟“

’’اُستاد جی ۹۹ فیصد آؤٹ ہونے کے چانسز ہیں اور اگر آج رات بارہ ایک بجے تک آؤٹ ہوگیا تو پھر صبح وہی والا پرچہ آئے گا۔‘‘

’’یار یہ تو تُم دونوں نے بہت بڑی خبر سُنا دی ہے۔ اِس کا مطلب ہے کہ ایک رات میں تیاری کرلوں گا۔ مگر کیمسٹری بڑا ہی مشکل مضمون ہے، سر کھپ جاتا ہے سمجھ میں نہیں آتا۔ ویسے صبح کوئی بُوٹی میرا مطلب نقل وغیرہ نہیں چل سکتی۔‘‘

’’بھئی وہ رسک تُم لینا چاہو تو لے لینا ہم رات کو یہ بتادیں گے کہ صبح پرچے میں کون کون سے سوال آئیں گے۔‘‘

☆......☆

سہیل جس پریشانی اور اضطراب کے ساتھ کمرے سے نکلا تھا، واپس آیا تو چہرے کے تاثرات یکسر بدلے ہوئے تھے۔ کاشف بھی اُسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

’’ارے بڑے خوش دکھائی دے رہے ہو، کیا چکر ہے؟‘‘

’’بس یار سمجھو، میری دُعا سن لی گئی۔‘‘

’’کیا کہہ رہے ہو یار، تمھاری دُعا تو بڑی خطرناک تھی، وہ کیسے سُن لی گئی؟‘‘

’’بھئی آج رات امکان ہے کہ کیمسٹری کا پیپر آؤٹ ہوجائے گا۔‘‘

’’تو کیا تُم پیپر آؤٹ ہوجانے کے بعد تیاری شروع کروگے؟‘‘

’’ہاں تو اور کیا، اَب بھلا میں فضول میں وقت کیوں ضائع کروں اور وہ سوال خواہ مخواہ یاد کرتا رہوں جو صبح آنے ہی نہیں۔ ایسے تو ذہن اور زیادہ پریشانی کا شکار ہوجائے گا۔ اِس لیے پیپر آؤٹ ہونے کے بعد ہی آرام سے تیاری شروع کروں گا۔‘‘

’’میرے خیال میں تو اچھا ہے کہ تم ابھی بھی پڑھتے رہو اور جب پرچہ پتا چلے گا تو اُن سوالوں کی مزید تیاری کر لینا۔ ویسے آج کل بڑی سختی ہے۔ کیا پتا پرچہ آؤٹ نہ ہی ہو اور اگر ہو بھی جائے تو اکثر بورڈ والوں نے دو تین اور پرچے بھی احتیاطاً بنائے رکھے ہوتے ہیں، اگر صبح کوئی اور پرچہ آ گیا تو پھر کیا کروگے؟‘‘

اِس دوران سہیل اپنے سامنے کیمسٹری کی کتاب رکھے بستر پر نیم دراز ہو چکا تھا۔ وہ بولا: ’’تُم ہو تو میرے ہم کمرہ مگر ہمیشہ میرا بُرا ہی سوچتے ہو۔‘‘ سہیل نے یہ بات مسکراتے ہوئے کہی۔

کاشف اُس کی ہنسی میں چھپی شرارت بھانپ کر کہنے لگا۔ ’’مَیں نے تمھارا بُرا کیوں سوچنا ہے بھئی، مجھے تو لگتا ہے کہ تُم خود ہی اپنے ساتھ بُرا کرتے رہتے ہو۔‘‘

’’اچھا جی اچھا، اُستاد جی بلکہ پروفیسر صاحب آپ دھیان سے پڑھیں اور مجھے بھی پڑھنے دیں۔‘‘

یہ کہہ کر سہیل نے کاشف کو شرمندہ کردیا اور پھر کمرے

میں خاموشی چھا گئی۔
یہ خاموشی تو اَب پورے ہاسٹل میں چھائی ہوئی تھی۔ ایک طبقہ بڑے انہماک سے پڑھنے میں مصروف تھا، دوسرا طبقہ پیپر آؤٹ ہونے کے لیے بے چین تھا اور ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو بالکل ہی لاپروا اور بے فکر تھا کہ صبح دیکھا جائے گا۔
سہیل کو تو پیپر آؤٹ ہونے کا انتظار تھا۔ جب اُس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی تو بارہ بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔ وہ اطہر اور سراج کے کمرے کی طرف جانے کی غرض سے اُٹھ کھڑا ہوا وہاں پہنچا تو دیکھا کہ دونوں پڑھائی میں جُتے ہوئے ہیں۔
''ہاں بھئی پیپر کا کیا بنا؟''
''ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ملی یار۔ جونہی پتا چلتا ہے، تمھیں بتاتے ہیں فکر نہ کرو۔''
''یار دیکھنا پھنسا نہ دینا، مَیں نے تو اِسی وجہ سے تیاری بھی نہیں کی کہ پرچہ ملتا ہے تو پھر تیاری کرتا ہوں۔''
سراج فکر مندی سے بولا: ''یار تمھیں کس نے کہا تھا کہ تیاری نہ کرو، تیاری تو کرتے رہتے، جب پیپر آؤٹ ہوتا تو اُن سوالوں کی اَور زیادہ تیاری کر لیتے۔''
''مجھے لگتا ہے کہ تُم دونوں نے مجھ سے ٹریٹ لینے کے لیے فراڈ کیا ہے۔''
اطہر ہنس دیا اور بولا: ''ہاں ہاں ہم نے تُم سے پچاس ہزار روپے لیے ہیں کہ پرچہ آؤٹ کرواتے ہیں، وہ واپس لے لینا۔''
سہیل بھی ہنس پڑا مگر اَب اِس ہنسی میں خوشی نہ تھی کیوں کہ جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا تھا اُس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہورہا تھا۔
ایک بار پھر سہیل بولا: ''یا اللہ صبح جنگ ہی شروع ہوجائے، کوئی دھماکا ہوجائے، میری تو بالکل بھی تیاری نہیں ہے۔''
یہ کہتے ہوئے سہیل اُن کے کمرے سے نکل گیا۔ افسوس کہ رات بھر انتظار کے باوجود پرچہ آؤٹ نہ ہوا۔
صبح تمام طلبہ امتحانی مرکز پہنچے، کمرۂ امتحان میں کیمسٹری کا پرچہ دینے کے لیے سبھی طلبہ موجود تھے۔
اطہر، سراج اور صغیر حیران و پریشان تھے کہ پرچہ شروع ہونے والا ہے اور سہیل اَب تک آیا نہیں۔
کاشف اُن کے پاس پہنچا تو اُنھوں نے سہیل کے متعلق استفسار کیا۔ کاشف نے رُندھی ہوئی آواز میں جواب دیا: ''دراصل رات تقریباً اڑھائی بجے سہیل کے گھر سے فون آ گیا۔ اُس کے ابّو اچانک دِل کا دورہ پڑنے سے فوت ہوگئے۔ باقی تینوں دوستوں کے مُنھ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ سہیل نے بڑی بڑی اور بُری بُری خواہشیں کیں۔ خواہش پوری تو ہوگئی مگر اُس کی قیمت بہت بڑی اَدا کرنا پڑی۔

☆......☆

سرکس کا ہاتھی

احمد عدنان طارق

وہ سرکس کا اک ہاتھی تھا
اور زاہد اس کا ساتھی تھا
وہ دونوں کرتب کرتے تھے
اور پیٹ کو اپنے بھرتے تھے
زاہد اٹھارہ سال کا تھا
تو ساتھ یہ خوب کمال کا تھا
زاہد کا باجا بجتا تھا
تب ہاتھی ناچا کرتا تھا
پھر روز کے بم دھماکوں سے
اور دن دیہاڑے ڈاکوں سے
سرکس کی کمائی گھٹتی گئی
لوگوں کی آمد چھٹتی گئی
مالک نے ہاتھی بیچ دیا
زاہد کا ساتھی بیچ دیا
چڑیا گھر میں ہاتھی رہتا تھا
چپ چپ تھا کچھ نہ کہتا تھا
عملہ سب حیران تھا
بھئی ہاتھی جو پریشان تھا
پوچھا سرکس کے مالک سے
یہ رشتے نازک نازک سے
مالک نے سب کچھ سمجھایا
زاہد کو فوراً بلوایا
بچھڑے دونوں مل بیٹھے تھے
پہلے ان کے دل بیٹھے تھے

اب زاہد گانے گاتا ہے
اور ہاتھی ناچ دکھاتا ہے

ہائے رے سردی......اُف یہ گرمی

اف یہ گرمی
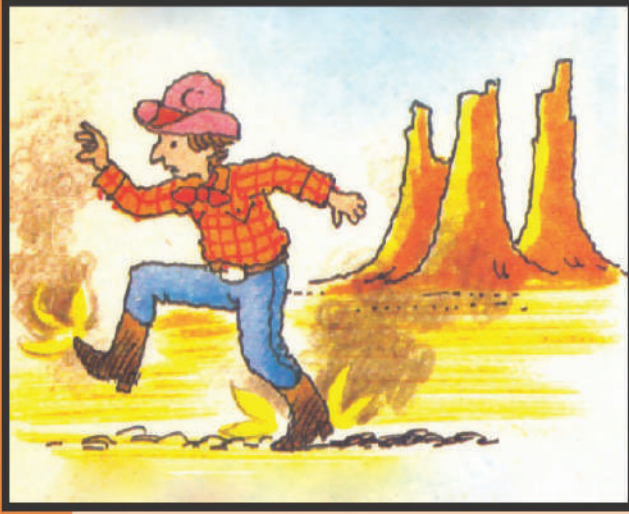
ویسے تو کراچی کے لوگوں کو گرمی کی شدت کا اندازہ پچھلے سال ہو گیا تھا لیکن تاریخ کہتی ہے کہ امریکا کی ریاست کیلی فورنیا کے صحرا میں ۱۹۷۱ء کو ایسی گرمی پڑی کہ اللہ کی پناہ...... چھ ہفتوں تک درجہ حرارت ۴۹ سینٹی گریڈ سے اوپر رہا۔ شکر کیجیے کہ آپ اس وقت وہاں نہیں تھے۔

اُف یہ سردی

براعظم انٹارکٹیکا اس دنیا کا سب سے سرد مقام ہے۔ یہاں اتنی زیادہ سردی پڑتی ہے کہ کوئی انسان رہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ یہاں سب سے کم جو درجۂ حرارت نوٹ کیا گیا ہے وہ ۴۹ منفی سینٹی گریڈ ہے (منفی ۲۷ فارن ہائیٹ) لیکن انٹارکٹیکا میں سائبیریا کے مقام پر ایک بستی قائم ہے جہاں ہزاروں لوگ رہتے ہیں۔ اس علاقے میں سب سے کم درجۂ حرارت منفی ۶۸ سینٹی گریڈ (منفی ۹۸ فارن ہائیٹ) ریکارڈ کیا گیا ہے۔ آپ ان علاقوں میں سردیوں کی چھٹیاں گزارنے مت چلے جایئے گا ورنہ آپ کا حشر بھی تصویر والی خالہ جیسا ہو سکتا ہے۔

پانی کا فوارہ

عزیز ساتھیو السلام علیکم! آپ نے کسی پارک میں یا کسی بڑے چوراہے میں فوارے کا نظارہ کیا ہوگا۔ اب آپ کو فوارہ دیکھنے کے لیے کسی پارک یا چوراہے میں نہیں جانا پڑے گا۔

ہم آج آپ کو گھر پر ہی فوارہ بنانا سکھاتے ہیں۔

اچھے طلبہ کی طرح ضرورت کی تمام اشیا تجربہ شروع کرنے سے پہلے اپنے پاس رکھ لیں۔

کن کن چیزوں کی ضرورت ہے؟

ایک بوتل (ڈھکن سمیت)،
ایک مضبوط پلاسٹک کی نلکی (Straw)،
لچکدار موم (ہوابند کے لیے)
ڈرائنگ پن(Thumb pin)،
سرخ رنگ، گرم پانی سے بھرا ہوا ڈونگا(Bowl)

۱۔ بہت احتیاط کے ساتھ بوتل کے ڈھکن میں سوراخ کریں۔

۲۔ بوتل کو آدھا ٹھنڈے پانی سے بھریں اور چند قطرے سرخ رنگ کے ڈال دیں۔ (سرخ رنگ لازمی نہیں۔ آپ اپنی مرضی سے کوئی بھی رنگ استعمال کر سکتے ہیں۔) ۳۔ بوتل کے ڈھکن کو اچھی طرح مضبوطی سے بند کریں اور سوراخ میں نلکی (Stroaw) ڈال دیں۔ ۴۔ نلکی کے اطراف کو بند کرنے کے لیے موم کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ۵۔ اسی طرح نلکی کے اختتام پر ہوا کے داخلے کو بند کرنے کے لیے موم لگائیں اور کیل پرو دیں۔ ۶۔ اس بوتل کو گرم پانی کے ٹب میں ڈالیں اور اختتام پر اور درمیان میں لگے موم اور کیل ہٹا دیں۔

نتیجہ: ٹب میں موجود گرم پانی، بوتل کے اندر موجود ہوا گرم کردے گی جس کے ردعمل میں قوت اوپر کی جانب بڑھے گی۔ ایک خوبصورت رنگ برنگا فوارہ پانی ابھلے گا جو یقیناً آپ کو محظوظ کرے گا۔

''مسٹر جناح! تمھاری باتیں اتنی بور ہیں کہ میں ایک کان سے سنتا ہوں اور دوسرے سے نکال دیتا ہوں''
''لگتا ہے جناب والا کے دونوں کانوں کے درمیان والی جگہ خالی ہے''
''مسٹر محمد علی جناح! آپ اب مسلم لیگ میں آئے ہیں۔ یہ مت بھولیں کہ پہلے آپ بھی کانگریس میں تھے''
''ہاں! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں پہلے میں پرائمری میں تھا۔ اب سیکنڈری اسکول میں آیا ہوں''
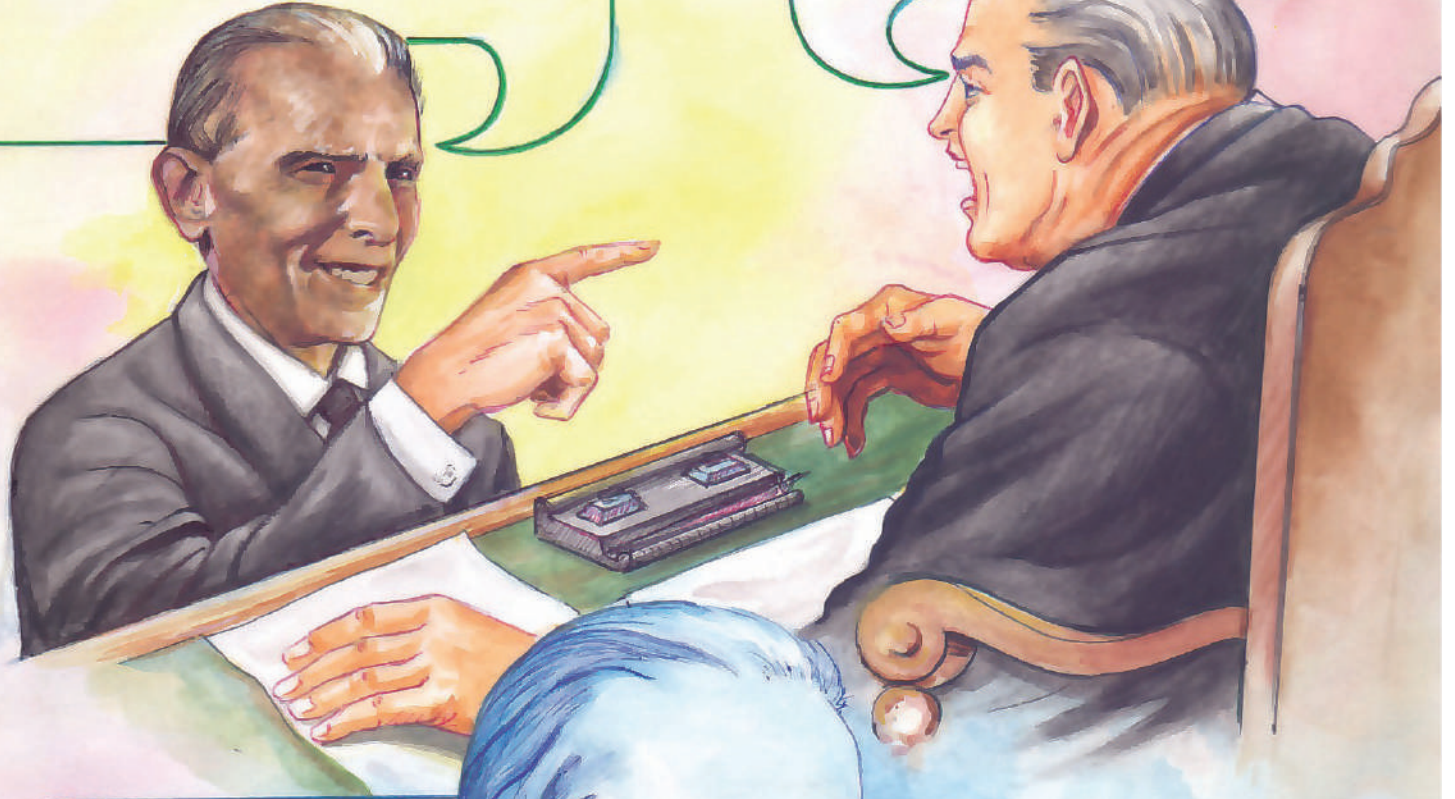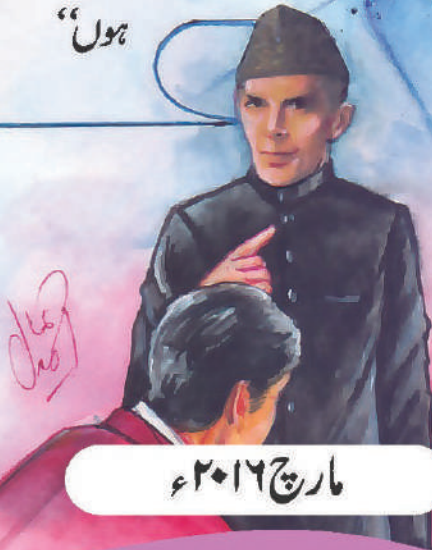
بچوں کے معروف شاعر، ادیب اور کالم نگار احمد حاطب صدیقی کی کھٹی میٹھی باتیں

ملاقات: فصیح اللہ حسینی، محمد طارق خان، عبدالصمد بھٹی، محمد یوسف منیر

احمد حاطب صدیقی جنھیں لوگ ابونثر کے نام سے بھی جانتے ہیں، گزشتہ دنوں وہ اسلام آباد سے کراچی شاہین کیمپ کے ایک پروگرام میں شریک ہونے کے لیے تشریف لائے، موقع غنیمت جانتے ہوئے ہم بھی وہاں پہنچ گئے اور اُن سے سوالات کی بوچھاڑ کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔ احمد حاطب صدیقی کا یادگار اور مزیدار انٹرویو قارئین ساتھی کی خدمت میں حاضر ہے۔

ساتھی: ”سب سے پہلے اپنا تفصیلی تعارف کروائیے۔“

جواب: ”تفصیل مت پوچھیے۔ تفصیل میں گئے تو یہ رات گزر جائے گی یا آپ

(اللہ نہ کرے، ہم کھانسے) مختصر تعارف پر گزارہ کیجیے۔ میرا نام احمد حاطب صدیقی ہے۔ والد مرحوم کا نام ابوالحسنات صدیقی۔ ۳/فروری ۱۹۵۶ء کو پیدا ہوا۔ ۲۹/اکتوبر ۱۹۷۸ء سے ۲/فروری ۲۰۱۶ء تک پی آئی اے میں ملازمت کی اور اس عرصے میں لکھنے لکھانے کا مشغلہ بھی جاری رکھا۔ تعارف میں بس اب تاریخ وفات ہی درج ہونے کا انتظار باقی ہے۔''

ساتھی: ''اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ چلیے اپنے بچپن کی کچھ باتیں ہی بتا دیجیے۔''

احمد حاطب صدیقی: ''اپنے بچپن کے دن تو خوب اچھی طرح یاد ہیں۔ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے خواب دیکھتے دیکھتے اچانک آنکھ کھل گئی ہو۔ اِس خواب کا ایک منظر بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔ منظر کچھ یوں ہے کہ سامنے ایک بڑا سا تخت بچھا ہوا ہے۔ تخت پر ایک صاف اور سفید چاندنی بچھی ہوئی ہے۔ کچھ لوگ گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے ہوئے اِس تخت پر بیٹھے ہیں۔ یہ تخت گویا اسٹیج ہے۔ تخت کے سامنے ایک مجمع ہے۔ مجمع خاموشی اور ادب سے اپنی اپنی نشستوں پر خاموش بیٹھا ہے۔ تخت کے اوپر بالکل درمیان میں ایک بزرگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ سفید دُودھیا کرتا پاجامہ پہنے ہوئے۔ سر پر سفید کپڑے کی دو پلی ٹوپی۔ خوب گھنی، پھیلی ہوئی اور سلیقے سے ترشی ہوئی وسیع و عریض سفید نورانی داڑھی جس نے اُن کے چہرے کو بارعب اور پُرنور بنا دیا ہے۔ اِس وقت اپنے بچپن کے اِن مناظر کو کسی خواب کی طرح نظروں میں پھرتا دیکھنے والا یہ بچہ اُن بزرگ کی گود میں بیٹھا ہے...... تصویرِ حیرت بنا ہو...... زرق برق شیروانی پہنے ہوئے اور زرق برق ٹوپی اوڑھے ہوئے۔ بچے کے والد بھی ہم نشیں ہیں جن کی شکل وصورت اِنھی بزرگ سے مشابہہ ہے۔ بچے کے سامنے ایک رحل ہے۔ رحل پر قرآن پاک کا ایک نہایت حسین وجمیل حمائی نسخہ لاکر رکھ دیا جاتا ہے۔ یکا یک بزرگ کی بارعب آواز گونجتی ہے:

''بیٹا کہو: اعوذ باللّٰہ من الشّیطان الرّجیم''

بچے نے اِن کلمات کو دوہرایا۔ بزرگ کی آواز پھر گونجی:

''بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم''

بچے نے بھی بسم اللہ پڑھی۔ پھر بزرگ نے بچے کے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت تھام کر کلام پاک پر رکھی۔ اب اُنھوں نے سورہ علق کی پہلی آیت سے پڑھانا شروع کیا:

''اقرا باِ سم ربک الذی خلق''

بچہ پڑھتا چلا گیا۔ ''علّم الانسان مالم یعلم'' تک پڑھانے کے بعد بزرگ نے ہاتھ اُٹھا کر دعا کروائی۔ مجمع کے ساتھ ساتھ بچے نے بھی اپنے ننھے منے ہاتھ اُٹھا لیے۔ وہ بھی سب کی آواز میں آواز ملا کر ''آمین...... آمین'' کہتا رہا۔ یہ ''رسمِ بسم اللہ'' کی تقریب تھی۔ جو اُس زمانے کے دین دار گھرانوں میں

بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی تھی۔ رسم بسم اللہ کے بعد بغدادی قاعدہ شروع کرایا گیا۔ اُس وقت عمر ہو گی...... یہی کوئی چار سال، چار مہینے اور چار دن...... بچپن کی یادوں میں سے یہ سب سے پہلی یاد ہے جو آج بھی ذہن میں تازہ ہے۔ باقی سب یادیں اس سے بڑی عمر کی ہیں۔"

ساتھی: "بغدادی قاعدے کے بعد کا علمی سفر؟"

احمد حاطب صدیقی: ابتدائی جماعتیں میں نے ملیر توسیعی کالونی کراچی کے ایف ساؤتھ ایریا میں واقع ایک اسکول سے پاس کیں، جو عرفِ عام میں "ڈبل اسٹوری" اسکول کہلاتا تھا۔ وہاں کے معلم جماعت جناب شبیر احمد صاحب اب تک یاد ہیں۔ ثانوی جماعتیں میں نے جس اسکول سے پاس کیں اُس کا نام "سرکاری مدرسۂ ثانویہ سعودآباد" تھا، مگر افسوس کہ اب یہی ادارہ "گورنمنٹ بوائز سیکنڈری اسکول سعودآباد" کہلاتا ہے۔ یہاں جن اساتذہ نے تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا کام بھی سرانجام دیا، اُن میں جناب واجد علی زیدی، جناب محمد ہاشم اور جناب افسر عمران کا نام آتا ہے۔ افسر عمران صاحب نے مجھ پر خصوصی توجہ دی۔ ادبی ذوق پیدا کیا۔ تقریر کرنے کا طریقہ سکھایا اور عملاً سکھایا۔ جملے کیسے ادا کرتے ہیں۔ لہجے میں نشیب و فراز کس طرح پیدا کیا جاتا ہے۔ شعر کا استعمال کس انداز سے کیا جاتا ہے۔ دورانِ تقریر ہاتھ سے اور چشم و اَبرو سے اشاراتی تاثرات کیسے دیے جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ اُنھوں نے ایک کھردرے پتھر کو ہیرا بنا دیا۔ اپنے دورِ طالب علمی میں بہت سے تقریری مقابلوں اور مباحثوں میں اول انعامات حاصل کیے۔ یہ سب افسر عمران صاحب کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ میری مشہور نظم "اُستادِ محترم کو میرا اسلام کہنا" درحقیقت افسر عمران صاحب ہی کو خراجِ تحسین ہے۔ انٹرمیڈیٹ کی تعلیم میں نے قائداعظم کے قائم کردہ کالج سندھ مسلم (سائنس) کالج سے حاصل کی۔ وہاں کے اساتذہ میں اُردو کے اُستاد اشرف شیر صاحب (مرحوم) نے میری تحریری صلاحیتوں کو جِلا بخشنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اُنھوں نے مجھے کالج کے اُردو میگزین کا مدیر بھی بنایا تھا۔ پھر میں نے جامعہ کراچی کے شعبہ ریاضی سے بی ایس سی (آنرز) کیا اور کلیہ معارف اسلامیہ، جامعہ کراچی سے علومِ اسلامی میں ایم اے کیا۔

ساتھی: "پہلی نظم یا کہانی کب کہی؟ اس پر کوئی انعام ملا؟"

احمد حاطب صدیقی: سب سے پہلے تو میں آپ کو اس بات پر داد دوں گا کہ آپ نے "کہانی کہنے" کی ترکیب استعمال کی ہے۔ کہانی ہے ہی کہنے کی چیز۔ لکھنے کی چیز تو یہ بعد میں بنتی ہے۔ کہانی کا لفظ "کہانت" سے بنا ہے۔ جس کا مطلب ہے کوئی بات اپنے جی سے گھڑ کر کہنا۔ "کاہنوں" کا یہی کام ہوتا تھا۔ اس کے

علاوہ بھی کاہن حضرات بہت سے کام اپنے ذمے لے لیتے تھے۔ میں نے سب سے پہلی کہانی بھی مزاحیہ کہانی لکھی تھی۔ عنوان تھا ''سراغ رساں''۔ یہ کہانی ۱۹۶۸ء میں روزنامہ ''جنگ'' کراچی کے بچوں کے صفحے پر شایع ہوئی تھی۔ اس کہانی میں ایک بچہ سراغ رساں بن کر گھریلو جرائم کی تفتیش کرتا تھا۔ جرائم بھی کیسے؟ ایسے کہ ''شمی کی ٹافیوں کی پُراسرار چوری'' اور ''سیما کی گڑیا کا لرزہ خیز قتل'' وغیرہ۔ اس کہانی پر مجھے انعام میں ایک کیمرہ ملا تھا۔ سب سے پہلی نظم سے پہلے میں آپ کو اپنا کہا ہوا سب سے پہلا شعر سنا دیتا ہوں۔ غالباً اُس وقت میں چھٹی جماعت کا طالب علم تھا جب یہ شعر کہا:

الٰہی تو مالک ہے ہر ایک کا
برے کا، بھلے کا، بد و نیک کا

دیکھیے دوسرے مصرعے سے بچپنا صاف جھلک رہا ہے۔ تکرار ہے۔ بُرے اور بھلے کا ذکر کر دینے کے بعد بدو نیک کہنا محض تکرار ہے۔ مگر مجھے خوشی ہے کہ میں نے پہلا شعر حمد کا کہا۔ پہلی نظم بھی یہی نظم تھی۔ اس کا ایک شعر اور یاد آ گیا:

گنہگار کا بس سہارا ہے تو
ہمارا ہے تو ہاں ہمارا ہے تو

موجودہ پُرمزاح نظموں میں سے سب سے پہلی نظم جو پروفیسر سلیم مغل صاحب کے اصرار پر کہی تھی، وہ تھی ''بدھوسی ایک بچی''۔

سیما نے مجھ سے پوچھا
اے میرے پیارے چچا
یہ روز آپ مجھ کو
دیتے تھے کیسا غچا

ساتھی: ''آپ نے جو پیاری پیاری نظمیں لکھی ہیں کیا وہ ساری طبع زاد ہیں؟ یہ سوال ہم اس لیے پوچھ رہے ہیں کہ علامہ اقبالؔ نے بچوں کے لیے جتنی نظمیں لکھی ہیں وہ سب مغرب سے ماخوذ ہیں۔''

احمد حاطب صدیقی: ''صرف ایک نظم ایسی ہے جو ترجمہ ہے۔ پروفیسر سلیم مغل نے مجھے ایک نظم دی کہ آپ اسے اُردو میں نظم کر دیں:

The pigeon said coo
What shall I do?
I haven't enough food
For a family of two
"Foolish bird!" said the hen
My family is the Ten
And we all live
Like gentlemen.

میں نے اس نظم کا ترجمہ ''دس بچے خوش حال گھرانا'' کے عنوان سے یوں کیا:

کبوتر بولا: ''غٹر غوں!

یا اللہ میں کیا کروں؟
دو افراد کے کنبے کو
آخر میں کیسے پالوں؟
کیا لاؤں خود کھانے کو
کیا ان کے منھ میں ڈالوں؟
روتا کڑھتا رہتا ہوں
غوں غوں، غوں غوں، غٹر غوں!''
مرغی بولی: ''بے وقوف!
دیکھ میں کتنی موٹی ہوں
دس افراد کا کنبہ ہے
کیسی خوش خوش رہتی ہوں
صبح سویرے اُٹھتے ہی
دانہ سب کو چُگاتی ہوں
رب کا شکر ادا کرکے
خود عزت سے کھاتی ہوں
تو بھی اُٹھ اور محنت کر
کیوں روتا ہے غوں غوں غوں؟''

ساتھی: ''آپ کی نظمیں دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ آپ شاعر بڑے ہیں۔ لیکن پھر آپ کی کہانیاں پڑھ کر آپ کو بڑا کہانی نگار ماننے میں بھی کوئی پس و پیش نہیں ہوتا۔ آپ بتائیے آپ شاعر ہیں یا کہانی نگار؟''

احمد حاطب صدیقی: ''یہ تو ایسا ہی سوال ہے کہ جیسے آپ سے پوچھا جائے کہ آپ مدیر ہیں یا قلم کار؟ کہانی نویس ہیں یا کالم نگار؟ ارے بھئی ایک آدمی کی بعض اوقات کئی کئی حیثیتیں ہوتی ہیں۔ وہ بیٹا بھی ہوتا ہے، بھائی بھی ہوتا ہے اور دوست بھی ہوتا ہے۔ میں نے شاعری بھی کی ہے، کہانیاں بھی لکھی ہیں، کالم نگاری بھی کر رہا ہوں...... ''زندگی میری سہ نیم!''

ساتھی: ''آپ بہت عمدہ کہانیاں لکھا کرتے تھے، لیکن اب آپ کی کہانیوں کے لیے قارئین ترس گئے ہیں۔ اب آپ کہانیاں کیوں نہیں لکھتے؟ بلکہ ابھی طے کر لیجیے کہ آپ ''ساتھی'' کے لیے کہانی کب لکھ رہے ہیں؟''

احمد حاطب صدیقی: نظموں کی طرح، بچوں کے لیے لکھی جانے والی کہانی بھی ''آمد'' کی محتاج ہوتی ہے۔ بچوں کے لیے لکھنا، جیسا کہ مولانا محمد حسین آزاد نے کہا، بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اس کے لیے خود بھی بچہ بننا پڑتا ہے۔ میری سب کہانیاں ایک خاص موڈ کی پیداوار ہیں۔ ''بینگن کو پولیس پکڑ کر لے گئی''...... ''بے چارے فکری ماموں''...... ''کلاس رُوم''...... اور...... ''منو میاں نے نانی اے ہے کی مدد کی''...... وغیرہ وغیرہ۔ آپ کو سب میں ایک مخصوص شرارتی موڈ نظر آئے گا۔ آپ دعا کریں کہ پھر وہی موڈ طاری ہو تو ''ساتھی'' کے ساتھیوں کے لیے کوئی نئی کہانی لکھی جائے۔ ورنہ بقول شاعر:

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل

کہاں کی رُباعی؟ کہاں کی غزل؟
ساتھی: ''آپ کی کون سی کہانی اور کون سی نظم سب سے مقبول ہوئی اور کیوں؟''
احمد حاطب صدیقی: ''کہانیوں میں تو وہ چاروں کہانیاں بہت مقبول ہوئیں جن کا میں نے ابھی ابھی آپ سے ذکر کیا ہے۔ البتہ ''کلاس روم'' کو مقبولیت اس لیے زیادہ حاصل ہوئی کہ اس کہانی کو پاکستان ٹیلی وژن ،کراچی مرکز کی پروڈیوسر محترمہ فہمیدہ نسرین نے بچوں کے ایک پروگرام میں ڈرامائی صورت میں بھی پیش کیا تھا۔ ان چاروں کہانیوں کی مقبولیت کا جو سبب میں سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ تمام کہانیاں نہ صرف پُر مزاح ہیں، بلکہ کہانی ہی کہانی میں بچوں کو تعلیم بھی دی گئی ہے۔ نظموں میں بھی کئی نظمیں مقبول ہوئیں مگر اس میں بھی سر فہرست ''یہ بات سمجھ میں آئی نہیں'' ہے۔ یہ نظم تو اس قدر مقبول ہوئی کہ موبائل پر ایس ایم ایس بن کر بھی چلی۔ دُنیائی وی کے مقبول پروگرام ''حسبِ حال'' کے عزیزی صاحب نے اس کی پیروڈی بھی پیش کی اور سونے پر سہاگہ یہ کہ بھارت میں بڑے بڑے شاعروں نے اس نظم کو اپنے نام سے سنا کر داد وصول کی۔ اس کے Clips آپ کو ''یوٹیوب'' پر ملیں گے۔ اس کے بعد سب سے مقبول نظم ''اُستادِ محترم کو میرا اسلام کہنا'' ہوئی۔ ویسے ''بدھوسی ایک بچی'' اور ''تانگے کا ایک گھوڑا'' بھی کم مقبول نظمیں نہیں ہیں۔ ''شامہ کی بلی'' بھی بے حد مقبول ہوئی۔ ان نظموں کی مقبولیت کا سبب بھی میں یہی سمجھتا ہوں کہ ان میں مزاح کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی ہے۔''
ساتھی: ''آپ نے بڑوں کے لیے بھی شاعری کی، لیکن مزہ کس شاعری میں آتا ہے؟''
احمد حاطب صدیقی: بچوں کے لیے کی جانے والی شاعری میں بچوں کو مزہ آتا ہے اور بڑوں کے لیے کی جانے والی شاعری میں بڑوں کو مزہ آتا ہے۔ شاعر کو تو اپنی ساری شاعری میں مزہ آتا ہے۔ مزہ نہ آئے تو شاعری کیسے کر پائے گا؟''
ساتھی: ''نومبر کے سالنامے میں پروفیسر عنایت علی خان صاحب کا انٹرویو چھپا تھا۔ وہ آپ کی بہت تعریفیں کر رہے تھے۔ سچ بتائیے آپ نے اُن سے کچھ کہا تو نہیں تھا؟''
احمد حاطب صدیقی: ''اُن سے تو بہت کچھ کہاسنا ہے۔ مگر یقین جانیے کہ اُن سے یہ اپیل کبھی نہیں کی کہ...... ''من تراحاجی بگویم،تو مرا حاجی بگو''...... (میں تمھیں حاجی کہوں گا، تم مجھے حاجی کہو)...... پروفیسر صاحب ہمارے بزرگ ہیں اور بزرگوں کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنے خردوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں تاکہ اُن کے چھوٹوں کا قد بھی اُنھی کے قد کی طرح اونچا ہو سکے۔ ارے صاحب! ہمارے بڑوں ہی نے ہمیں بڑا کیا ہے۔''
ساتھی: ''ایک کامیاب شاعر اور ادیب کے لیے کن

چیزوں پر عمل کرنا ضروری ہے؟''

احمد حاطب صدیقی: ''مطالعہ سب سے ضروری ہے۔ شاعری کرنے کے لیے اچھی شاعری کا وسیع مطالعہ ہونا چاہیے اور یہ مطالعہ سرسری نہیں بلکہ فنی مطالعہ ہونا چاہیے۔اسی طرح ادیب کو، جس صنف ادب میں بھی وہ خامہ فرسائی کر رہا ہے، اُس صنف کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیے اور فن کی تمام تکنیکوں سے واقف ہونا چاہیے۔''

ساتھی: ''اپنی ادبی زندگی کا کوئی یادگار واقعہ سنائیے!''

احمد حاطب صدیقی: ''یادگار واقعات تو بہت سے ہیں۔مگر یہ انٹرویو خاصا طویل ہو چکا ہے۔کیا آپ پورا انٹرویو شایع کر دیں گے؟ اچھا اگر کر دیں گے تو ایک واقعہ سن لیجیے۔آپ کے علم میں ہوگا کہ میں سرکاری ملازمت کے سبب (سرکار کی اجازت سے) اپنے قلمی نام ابونثر سے کالم نگاری کیا کرتا تھا۔جب میرے کالم شایع ہونا شروع ہوئے تو ہمارے خاندان کی ایک انتہائی بزرگ اور ثقہ شخصیت نے ایک روز ایک گھریلو دعوت کے دسترخوان پر موجود خواتین وحضرات کو مطلع کیا کہ ''جسارت'' میں ابونثر نام کا کوئی مزاح نگار آج کل کالم لکھ رہا ہے۔اس کے کالم بہت عمدہ اور لایق مطالعہ ہوتے ہیں۔آپ سب لوگ اس کا کالم پڑھا کریں۔یہ سن کر بہت سے لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔آخر اُن بزرگ کی صاحبزادی نے اُن سے پوچھا: ''ابا! آپ جانتے ہیں کہ یہ ابونثر کون ہے؟''

ابا بولے: ''نہیں۔کیا تمھیں معلوم ہے کہ کون ہے؟''

بیٹی نے بتایا: ''یہ حاطب ہیں جو ابونثر کے نام سے لکھتے ہیں''۔

بزرگ نے ماننے سے انکار کر دیا اور بے یقینی سے بولے: ''ارے حاطب کیا لکھیں گے ایسے کالم؟''

یہ تعریف میرے لیے سب سے یادگار تعریف تھی۔ کیوں کہ اُن بزرگ کے نزدیک اُن کالموں کا معیار میری صلاحیتوں سے زیادہ بلند تھا۔''

ساتھی: ''ادارہ ساتھی اور قارئین ساتھی کے لیے کوئی پیغام؟''

احمد حاطب صدیقی: ''ایک پیغام تو یہی ہے کہ ''جہاں رہو، خوش رہو''۔دوسرا پیغام یہ ہے کہ اپنی تحریر، تقریر یا اپنے کسی بھی عمل سے مایوسی کو فروغ دینے میں معاونت نہ کیجیے۔ مایوسی شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔تیسرا پیغام یہ ہے کہ لکھنے، پڑھنے یا کوئی بھی کام کرنے سے پہلے سوچ لیجیے کہ اس کام سے دنیا اور آخرت کا کوئی فائدہ ہوگا یا نہیں؟ دنیا سے مراد دُنیائے انسانیت ہے۔''

اس پہلے کہ ہم مزید سوالات کرتے، ہمیں اندازہ ہوا کہ کافی وقت ہو چکا ہے، اس لیے حاطب صاحب کا شکریہ ادا کر کے اپنی راہ لی۔
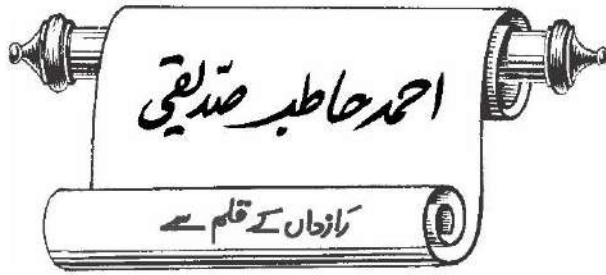
یہ شاید استاد رسا چغتائی کا شعر ہے:۔

جانے کن جنگلوں سے در آئے
شہر تنقید میں لکڑ ہارے

گمان ہے کہ استاد کے شعر پر کسی نے اپنا قد اونچا کرنے کے لیے تنقید کی ہوگی جس پر جل کر رسائی چغتائی نے یہ شعر کہہ دیا۔
ہم جب بھی استاد احمد حاطب کو پڑھتے ہیں تو رسا کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے۔اس کی وجہ یہ نہیں کہ شہر صحافت میں ان کی آمد کسی جنگل سے ہوئی ہے بلکہ ان پر تو یہ شعر صادق آتا ہے کہ:

فصیل شہر میں پیدا کیا ہے در میں نے
کسی بھی باب رعایت سے میں نہیں آیا

بعض لوگ اسے ''بابے کی رعایت'' پڑھتے ہیں جو بالکل غلط ہے اور شاید بے وزن بھی، خواہ آپ اس میں سے ''بھی'' نکال دیں۔ بندے کا اپنا وزن خواہ کچھ ہو، بات میں اور شعر میں وزن ہونا چاہیے اور یہ صفت کسی نے احمد حاطب میں خوب کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ یہ شعر خواہ کسی کا ہو لیکن احمد حاطب کی نذر (یا نظر) کیا جا سکتا ہے:

مری قدر کر اے زمین سخن
تجھے بات میں آسماں کردیا

احمد حاطب کے لیے رسا چغتائی کا یہ شعر ان کے نام کی وجہ سے یاد آ جاتا ہے۔ ہم تو نہیں لیکن ماہرین لسانیات کہتے ہیں کہ حاطب کا مطلب ہے لکڑ ہارا۔ حاطب اللیل عربی کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے رات کو لکڑیاں اکٹھی کرنے والا۔ ایک مطلب اور بھی ہے کہ اچھے، برے میں تمیز نہ کرنے والا۔ ان دونوں صفات کا اطلاق احمد حاطب پر نہیں ہو سکتا۔ ایک تو یوں کہ وہ اسلام آباد کے جس بڑے سے گھر میں آج کل رہ رہے ہیں وہاں رات کو کیا، دن میں بھی لکڑیاں چننے کا آسرا نہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ وہ جب کھوکھراپار نمبر ۲ میں رہتے تھے، تب چپکے سے یہ کام کر گزرتے ہوں کہ وہاں عرصے کے بعد گیس آئی ہے۔ ''عزت سادات'' کو ملحوظ رکھتے ہوئے ممکن ہے وہ یہ کام رات کو کرتے ہوں۔ ہم بھی ان کے گھر سے دور نہیں رہتے تھے لیکن سچی بات ہے کہ ہم نے انہیں دن یا رات لکڑیاں چنتے نہیں دیکھا البتہ آگ سلگاتے ہوئے ضرور دیکھا۔
ویسے حاطب کا ایک مطلب چاند بھی ہے جو رات کو ایک لکڑ ہارے کی طرح چیرتا ہے۔ لیکن یہ لکڑ ہارا کیا ہے جس میں ''ہارا'' شامل ہے۔ احمد حاطب کسی بھی میدان میں کسی سے ہارے تو نہیں۔ ان کا جثہ دیکھیے تو ان پر حاطب کے بجائے ''حِطب'' (ط کے

نیچے زیر) کا اطلاق ہوتا ہے جس کا مطلب ہے بہت دبلا، لاغر۔
احمد حاطب کے تقریباً پڑوس میں رہنے کی وجہ سے ان کا لڑکپن بھی دیکھا اور یہی خیال آیا کہ "اتنے سے قد پہ تم تو قیامت شریر ہو۔" آج بھی ان کی آنکھوں میں شرارت لہریں لیتی ہوئی صاف دکھائی دیتی ہے جیسے ابھی کوئی جملہ چست کر کے مزہ لیں گے۔ ان کو جب بھی دیکھا اتنا ہی دیکھا۔ اب جا کر بالوں میں کہیں کہیں چاندی کی جھلک نظر آتی ہے۔ گفتگو کرو تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بال دھوپ میں سفید کرنے کی ناکام سی کوشش ہے۔
ہم کبھی یہ طے نہیں کر پائے کہ وہ ابونثر زیادہ اچھے ہیں یا ابونظم۔ زندگی میں نظم وضبط تو وہ بڑی کوششوں سے لائے ہیں اور صحیح معنوں میں "خودساختہ" ہیں جسے عام طور پر سیلف میڈ کہا جاتا ہے۔ اب وہ جیسے بھی بنے اس میں کسی اور کا کوئی عمل دخل نہیں۔ وہ جس مقام پر ہیں اس کی سیڑھیاں انہوں نے خود طے کی ہیں اور بلاشبہ وہ کسی کے سہارے اوپر تک نہیں پہنچے۔
کھوکھراپار میں تو وہ دونمبری تھے یعنی کھوکھراپار نمبر ۲ میں رہتے تھے لیکن اس وقت کالم نگاری میں وہ بڑے نمبری ہیں۔ کتنے ہی کالم نگار اصل کام چھوڑ کر کالم کے نام پر مقالے لکھنے لگے لیکن احمد حاطب نے روش نہیں بدلی اور حیرت ہے کہ کثیرالتحریر ہونے کے باوجود سو میں سے کوئی ایک آدھ کالم ہی ہلکا ہوتا ہو۔ اس کا انہیں خود بھی احساس ہوتا ہے چنانچہ پھر وہ لطیفوں کا سہارا لیتے ہیں۔ مزاحیہ کالم نگار ہوتے ہوئے ان کے کالموں میں ایک راسخ العقیدہ مسلمان پھڑ پھڑا رہا ہوتا ہے۔ ایجنسیوں والے غور سے پڑھیں اور سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں تو احمد حاطب کو انتہا پسند قرار دے ڈالیں کیوں کہ اکبرالٰہ آبادی نے اپنا نام لے کر ایسے ہی لوگوں کے بارے میں بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ ؎

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

خدا کرے کہ ایجنسی والے اکبرالٰہ آبادی کی تلاش میں نہ نکل کھڑے ہوں کہ پہلے اس کو دھرتے ہیں۔ اکبر نے تو یہ شعر ۸۰ سال پہلے کہا تھا لیکن اب یہ کام زیادہ مشکل ہوگیا ہے۔ احمد حاطب جثے سے نہ سہی، بارلیش ہوتے ہوئے آسانی سے کسی مبینہ انتہاپسند تنظیم کے کھاتے میں ڈالے جاسکتے ہیں۔ ممکن ہے ان کی لاغری نے محفوظ رکھا ہوا ہو۔
ہمیں ابونثر یا احمد حاطب کی نظمیں زیادہ پسند ہیں جو وہ بچوں کے لیے لکھتے ہیں۔ بچے ان کے کالم سے تو محظوظ ہونے سے رہے لیکن نظموں سے تو بڑے بھی بلکہ بڑے بڑے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہ تو منڈی میں آلو کے بھاؤ بھی آلو ہی سے پوچھ بیٹھتے ہیں۔ حضرت، آلو تو آج کل سستے ہیں، کبھی ٹماٹر اور بھنڈی کا بھاؤ پوچھ کر دیکھیے لیکن کہیں وہ یہ نہ کہہ بیٹھیں کہ "مجھ سے نہ الجھو، بس جاؤ جاؤ۔" شاید یہ مبالغہ ہو، اور ہو تو ہوا کرے کہ اس وقت احمد حاطب بچوں کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔
احمد حاطب بچوں ہی کے نہیں بڑوں کے بھی شاعر ہیں۔ وہ جب ہمارے محلے میں تھے تب کا ایک شعر ہمیں اب بھی یاد ہے:

ٹکرا کے اختلاف کی دیوار توڑ دی
ضدی تھا، سر بلند ہوا خاندان میں

دیوار توڑنے پھوڑنے سے سرِ نازک پر کیا گزری ہوگی اس کا اندازہ ہی کیا جاسکتا ہے۔ ایک شاعر نے تو شکوہ کیا تھا کہ:

کہاں تک روؤں ترے خیمے کے پیچھے قیامت ہے
مری قسمت میں یا ربّ کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

لیکن پھر یہ شاعر کہیں سربلند نہ ہوا ہوگا۔ یہ شعر بھی ہم نے احمد حاطب ہی سے سنا ہے تو شاید انہی کا ہو:

نئے دیوانوں کو دیکھیں تو خوشی ہوتی ہے
ہم بھی ایسے ہی تھے جب آئے تھے ویرانوں میں

بھیا حاطب! تم تو اب بھی ویسے کے ویسے ہی ہو۔

احمد حاطب کو شاید یاد نہ ہو۔ ایک دن وہ بڑے ملول تھے اور انہوں نے ہم کو یہ شعر سنایا:

دوستوں کو دیکھا ہے جب سے فوج اعداء میں
ہم نے اپنی تلواریں ڈال لیں نیاموں میں

اس شعر کا ایک خاص پس منظر ہے جس کا اظہار مناسب نہیں۔ احمد حاطب نے اپنا دُکھ کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ نوعمری ہی میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تھا۔ ان کی والدہ نے احمد حاطب اور چھوٹے بھائی وجیہ احمد صدیقی کو بڑے جوکھم اُٹھا کر پالا اور حاطب نے بھی حق ادا کیا۔ لڑکپن ہی میں ریڈیو پاکستان کے لیے کچھ نہ کچھ لکھ کر لے جایا کرتے تھے۔ اب قائمہ کمیٹی برائے نشر و اشاعت نے تجویز دی ہے کہ ریڈیو پاکستان کو بچانا ہے تو ہر نئی گاڑی کی خریداری پر ۵ ہزار روپے اور ہر موبائل فون پر ایک روپیہ روزانہ جگا ٹیکس لگایا جائے تا کہ ریڈیو پاکستان کو بچایا جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ ریڈیو پاکستان کے زوال میں احمد حاطب کا وہاں جانے اور وہاں نہ جانے میں بظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آ رہا۔ بر سبیل تذکرہ احمد حاطب عرصے سے پی آئی اے سے وابستہ ہیں اور اس کی حالت بھی سب پر ظاہر ہے۔ لیکن ہماری خوش گمانی کہہ رہی ہے اگر پی آئی اے کے کچھ طیارے اُڑ رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی کوئی باکمال وہاں رہ گیا ہے۔ احمد حاطب جب کاغذ کے جہاز اُڑایا کرتے تھے تب سے اصلی جہاز ان کا سپنا تھا جو پورا ہوا۔ انہیں نے پیاسی کے لیے ننھی سی جان توڑ کر کام کیا اور ان میں مزید توڑ پھوڑ سے بچانے کے لیے انہیں پی آئی اے میں بھرتی کرانا پڑا۔ احمد حاطب کی عمر اتنی نہیں جتنے عرصے سے وہ لکھ رہے ہیں۔ وہ بقلم خود ۵۹ برس کے ہیں۔

احمد حاطب کے اجداد کا تعلق اعظم گڑھ کے قریب ایک قصبے بلیا سے ہے جہاں کا ہر شخص عالم، فاضل تھا۔ دارالمصنفین علی گڑھ کے قیام میں ان کے اجداد کا بھی حصہ ہے۔ احمد حاطب نے ایک بار ہندوستان میں اپنے آبائی علاقے کا دورہ بھی کیا تھا لیکن بات نہیں بنی۔ انہوں نے ایک بار کچھ دن اتھل میں بھی گزارے اس کی وجہ کچھ اتھل پتھل تھی جس کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی بات کچھ لمبی ہوگئی۔ ایک ایسے شخص کا خاکہ لکھنا پھوپی جی کا گھر نہیں (خالہ کوئی زندہ نہیں) جو شخص خود نہ صرف بڑے بڑوں کے خاکے لکھ چکا بلکہ خاکے اُڑا بھی چکا ہے۔ ہمارا کچھ لکھنا تو محض خاک اُڑانا ہے۔ کچھ کسر رہ گئی ہو تو احمد حاطب خود اضافہ کر لیں۔ یوں بھی وہ عرصے سے شہر اقتدار میں براجمان ہیں جس کے بارے میں پروفیسر عنایت علی خان نے کہا تھا کہ اسلام تو کیا آباد بھی کم ہے۔ لیکن یہ احمد حاطب کے وہاں پہنچنے سے بہت پہلے کی بات ہے۔ ہمارے لیے تو شہر اقتدار کا ہر باسی اور تازہ مقتدر ہے۔

ضدی بچہ

شریف شیوہ

بات بات پر رونا دھونا ہر پل چاہیے نیا کھلونا
کب یہ ضدی مانے بات پیار کرو یا جوڑو ہاتھ
چیز جو لینا چاہتا ہے اس پر وہ اَڑ جاتا ہے
مکھن، توس، نہ بھائے انڈا کٹھی میٹھی مانگے اشیا
ڈونگے میں جب سالن آئے چمچ پھیرے اُسے گرائے
ہاتھ سے گر چمچ کو چھینیں اچھلے، مچلے، مارے چیخیں
اپنی کرے ہر دَم من مانی چائے میں ڈالے ٹھنڈا پانی
ضد میں کرے سب اُلٹی باتیں گود میں لو تو مارے لاتیں

سارے گھر کو تنگ کرتا ہے
ڈانٹ ڈپٹ سے کب ڈرتا ہے

ایک جنگل میں گیدڑ کی حکومت تھی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہاں شیر نہیں تھے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ جنگل میں جمہوریت تھی اور جمہوریت میں جس کی اکثریت ہو حکومت اسی کی ہوتی ہے۔ اب چونکہ جنگل میں ہر طرف گیدڑ ہی گیدڑ تھے اس لیے ان کا ہی راج تھا۔

جنگل میں جمہوریت تو تھی لیکن قانون جنگل کا ہی تھا یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ اب جس کا جہاں زور چلتا وہ اپنا منہ مارنے سے باز نہیں آتا تھا۔ گیدڑ چونکہ طاقتور نہیں تھا اس لیے کوئی اس کی سنتا بھی نہیں تھا۔ گیدڑ کو بھی اس کی کوئی پروا نہیں تھی کہ کوئی اس کی سنتا ہے یا نہیں سنتا۔ وہ تو بس اسی میں خوش تھا کہ وہ جنگل کا لیڈر ہے۔

جنگل میں ہر طرف ایک افراتفری مچی رہتی تھی۔ ہر کوئی اپنی جان بچانے کی فکر میں رہتا لیکن اس کے باوجود کسی کی جان محفوظ نہیں تھی۔ جہاں کسی جنگلی جانور کا دل چاہتا وہ اپنی بھوک مٹانے میں ذرا بھی دیر نہ کرتا۔ شریف جانور اس بات کی شکایت لے کر روز گیدڑ کے

دربار میں پیش ہوتے لیکن وہاں ان کا سامنا لومڑیوں اور بھیڑیوں سے پیش آتا۔ جو انھیں دیکھ کر اپنی رال ٹپکانے لگتے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ پتا نہیں کہاں سے کوئی گدھا بھولا بھٹکا اس جنگل میں آ پہنچا۔ جنگل کا ماحول دیکھ کر پہلے تو وہ سٹپٹایا پھر گویا اس کی سمجھ میں کچھ انوکھا خیال آیا۔ اتنا شور مچایا کہ پورے جنگل کے جانور اس کے پاس جمع ہوگئے اور اس سے شور کی وجہ پوچھنے لگے۔

''میں جنگل کے راج کو چیلنج کرتا ہوں۔ یہاں ظلم ہو رہا ہے۔ میں اسے تبدیل کروں گا۔ آپ سب میرا ساتھ دیں۔'' گدھے کی زوردار تقریر سن کر کچھ جانور گدھے کے ساتھ ہو لیے۔ ان جانوروں میں اکثریت گھاس کھانے والوں کی تھی اور دوسری طرف گوشت خور گیدڑ کے ساتھ رہے۔ گویا اب جنگل میں گیدڑ کے مقابلے میں گدھے آ گئے۔

گیدڑ کو اپنی حکومت ختم ہوتی دکھائی دینے لگی تو اسے فکر ہوئی۔ اس نے فوراً اپنی کابینہ بلائی اور اس پر غور ہونے لگا کہ کس طرح گدھے کی آواز کو دبایا جائے۔ چیتے نے کہا کہ وہ اس کی گردن مروڑ دے گا۔ لومڑی بولی اس طرح تو وہ جنگل کا ہیرو بن جائے گا اور جو اس کے ساتھ نہیں وہ بھی اس کی پارٹی میں شامل ہو جائے گا۔ کچھ ایسا کرو کہ وہ مظلوم بھی نہ بنے اور اس کا کام بھی تمام ہو جائے۔ سبھی اس مسئلے پر سر جوڑے بیٹھے رہے۔ کسی نے کچھ تجویز دی تو کسی نے کچھ لیکن کسی بھی تجویز پر اتفاق نہیں ہو سکا۔ آخر تنگ آ کر گیدڑ نے محفل برخواست کر دی۔ گیدڑ کو ایسا لگ رہا تھا کہ گدھے کے پیچھے ضرور کسی کا ہاتھ ہے اس لیے اس نے سوچا کہ پہلے دھمکیاں دے کر دیکھا جائے پھر دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔

دوسری طرف گدھا گیدڑ بھبکیوں سے بے پروا جگہ جگہ جوش خطابت دکھانے میں مصروف تھا۔ اسے جو بھی ملتا وہ اسے اپنی پارٹی میں شامل کر لیتا۔ وہ یہ بھی نہیں دیکھتا کہ یہ تو خود ظالم ہے۔ گدھے کے شور نے بہت جلد ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ گیدڑ کی گرتی ہوئی شہرت کو دیکھ کر کچھ جنگلی جانور بھی اس کو چھوڑ کر گدھے کے کیمپ میں شامل ہو گئے تھے۔

شیر اپنی کچھاڑ میں بیٹھے یہ سب تماشا دیکھ رہے تھے۔ انھیں اس جمہوری تماشے سے کوئی لینا دینا نہیں تھا کیونکہ ان کی بھوک پیاس مٹ رہی تھی اور پھر انھیں لیڈر بننے کا شوق بھی نہیں تھا۔ کیونکہ لیڈر بن کر وہ پہلے بھی کئی بار بدنام ہو چکے تھے اس لیے وہ ایسا کوئی شوق پالنے کے چکر میں نہیں تھے۔ لیکن گدھے کی آمد نے ان کے بھی کان کھڑے کر دیے تھے اور وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

ادھر ہاتھی اپنی مستی میں مست، اپنے خاندان کو یکجا کر کے یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ انتخاب جیت سکتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا نظم و ضبط بہترین تھا اور وہ طاقتور بھی تھے لیکن ان کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ کسی اور کو اپنے ساتھ ملانے میں ابھی تک ناکام رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جو بھی ان کا ساتھ دینا چاہے وہ ان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلے بھلا ایسا کیسے ممکن تھا۔ ہر کوئی تو ہاتھی بن نہیں سکتا تھا اور وہ ہر ایک کو اپنی طرح دیکھنا چاہتے تھے۔

گینڈے بھی اپنی سینگ سے آگے دیکھنے کو تیار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اس لیے وہ بھی کسی کے ساتھ ملنے کے لیے تیار نہیں تھے البتہ آگے آگے چلنا چاہتے تھے۔ اسی لیے وہ اکثر چلتے چلتے بہت دور نکل جاتے تھے اور پیچھے جب بھی پلٹتے تو ان کے پیچھے کوئی نظر نہیں آتا تھا۔

زرافے اپنی گردن گھما گھما کر یہ ساری خبریں جنگل میں آگ کی طرح پھیلا رہے تھے۔ دور دور تک دیکھنے کے باوجود انھیں اکثر اپنے قریب میں ہونے والے واقعات کی خبر نہیں ہوتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ذرا ڈرپوک تھے یا پھر کسی سے دشمنی مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ لیکن گدھے کے شور نے اِنھیں بھی گردن اپنی طرف گھمانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسی لیے اب انھیں کچھ اور دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ انھیں گدھے کی خدمت میں اپنے مفادات جو دکھائی دینے لگے تھے۔ اسی لیے وہ ہر وقت گدھے ہی کی باتیں کرنے لگے تھے۔

جنگل کا انتخابی دنگل جوں جوں قریب آ رہا تھا، گیدڑ کی پریشانی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے گدھے کو ڈرانے کے لیے کچھ کتوں کو اس کے پیچھے لگا دیا تھا جو روز اس کے پیچھے بھونکتے۔ اس طرح وہ گدھے کی آواز کو دبانے میں تو کامیاب نہیں ہو سکے تھے لیکن اکثر جانوروں کو گدھے سے دور رہنے پر ضرور مجبور کر دیا تھا۔

اس سارے کھیل تماشوں سے دور بہت ہی دور جنگل کے کنارے دریا پر مگر مچھ بیٹھے آنسو بہا رہے تھے اور ان کے آنسو خشک کرنے والا کوئی نہ تھا۔ پتا نہیں انھیں کیا دکھ تھا جس کا وہ اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے پیٹ بھی بھرے ہوئے تھے اور دانت بھی خون آلود تھے۔ ان کے دانت صاف کرنے کے لیے ہر وقت کوئی نہ کوئی پرندہ آ کر ان کے پاس بیٹھ جاتا تھا اور ان کی مظلومیت بھری بپتا سنتا تھا۔ ان کی خاموشی سے اکثر جانور سمجھتے تھے کہ یہ سوگ میں بیٹھے ہیں۔ ان کی لگائی ہوئی موم بتیاں بھی سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھیں۔ پھولوں کی پتیاں پتا نہیں کہاں سے یہ لے کر یہاں بیٹھ جاتے تھے اور پھر دن بھر مگر مچھ آنسو بہاتے رہتے تھے۔

گیدڑ کو اپنی حکومت دور ہوتی دکھائی دینے لگی تو اسے پتا نہیں کیوں یہ لگنے لگا کہ جمہوریت خطرے میں

ہے۔ اُسے اس نے اپنے پرانے حریف بن مانسوں سے بھی ہاتھ ملانے میں کچھ عار محسوس نہ ہوئی۔ بن مانس تھے تو بڑے ہی بھلے مانس لیکن وہ صرف اپنوں کے لیے تھے۔ سارے جانور انھیں بہت شریف سمجھتے تھے اور ان کی عزت کرتے تھے۔ لیکن ان کے کالے کرتوتوں سے صرف وہی جانور آگاہ تھے جو اس کا شکار رہ چکے تھے۔ ان کی شرافت کا لبادہ اکثر جانوروں کو دھوکے میں ڈال دیتا تھا۔ بندر سب سے زیادہ ان کے فین دکھائی دیتے تھے کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ ان کی نسل سے ہی ہیں۔

گیدڑ اور بن مانس بظاہر تو دونوں ایک دوسرے کے سخت حریف اور دشمن سمجھے جاتے تھے لیکن یہ بات بہت کم جانور جانتے تھے کہ یہ گہرے دوست ہیں۔ انتخابی دنگل سے قبل دونوں نے مل کر منصوبہ بنایا کہ کس طرح انتخاب جیتنا ہے۔ دونوں نے مل کر ایک تحریری معاہدہ بھی طے کر لیا جو ابھی تک تحریری شکل میں نہیں تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے جرائم پر پردہ رکھنے کا وعدہ کیا اور باری باری حکومت کرنے کا عہد کیا۔ پھر باہمی رضا مندی سے انتخابی دنگل کروانے کے لیے لومڑیوں کو یہ کام سونپ دیا گیا۔

کہتے ہیں کہ اس جنگل میں اب بن مانس حکومت کر رہے ہیں۔ گدھے آج بھی جنگل میں شور مچا رہے ہیں لیکن کوئی ان کی ایک سننے کو تیار دکھائی نہیں دیتا۔ شیر اپنی کچھار میں بیٹھے ہیں اور جنگل کو محفوظ قرار دے رہے ہیں اور اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کبھی کبھی وہ کوئی بڑی کارروائی کرتے ہیں۔ جنگل میں آج بھی جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون ہے۔ اس جنگل پر ہر وقت گدھ منڈلاتے دکھائی دیتے ہیں لیکن سب خوش ہیں کہ وہ تو ابھی محفوظ اور زندہ ہیں۔ کیا آپ نے ایسا جنگل دیکھا ہے؟

☆......☆

غریب اور بہشت (حکایت سعدی)

دو آدمی قبرستان میں بیٹھے تھے۔ ایک اپنے دولت مند باپ کی قبر پر اور دوسرا اپنے درویش باپ کی قبر پر۔ امیر زادے نے درویش لڑکے کو یہ کہہ کر طعنہ دیا کہ میرے باپ کی قبر کا صندوق پتھر کا ہے۔ اس کا کتبہ رنگین اور فرش سنگِ مرمر کا ہے اور قیمتی پتھروں کی اینٹیں اس میں لگی ہیں۔ اس کے مقابلے میں تیرے باپ کی قبر کیسی خستہ حال ہے کہ اس میں عام مٹی پڑی ہے اور دو اینٹیں اس پر رکھی ہیں۔ امیر زادے کا طعنہ سن کر غریب لڑکے نے جواب دیا: ''یہ درست ہے! لیکن یہ بھی تو سوچو کہ قیامت کے دن جب مردے قبروں سے اٹھائے جائیں گے اس سے پہلے کہ تیرا باپ بھاری پتھروں کے نیچے جنبش کرے میرا باپ بہشت میں پہنچ چکا ہوگا۔'' (مرسلہ: شاہد حفیظ، میلسی)

باتھ روم کے آداب

حوائج ضروریہ سے فراغت کے لیے ہمیشہ اپنے آپ کوایک ٹائم ٹیبل کا پابند کرنا چاہیے ورنہ دن بھر پریشانی ہوتی ہے۔صبح سویرے اسکول جانے سے پہلے کی عادت بہتر رہتی ہے۔

کبھی قبلہ رخ مت بیٹھیے۔

باتھ روم جانے سے پہلے بایاں پاؤں رکھ کر یہ دعا ضرور پڑھیں۔

کوئی باتھ روم کے اندر ہوتو بار بار دروازہ کھٹکھٹانا نہیں چاہیے۔ایک آدھ اشارہ کافی ہوتا ہے۔

باتھ روم سے واپسی پر پہلے بایاں پاؤں رکھ کر یہ دعا ضرور پڑھیں۔

دن کا آغاز منہ ہاتھ دھو کر کریں۔وضو کرلیں تو اچھا ہے۔دن بھر پاکیزگی کا احساس رہے گا۔

باتھ روم کسی کے کمرے کے ساتھ ہوتو پانی چلا کر بیٹھیں تاکہ باہر آواز نہ آئے نیز بغیر اجازت نہیں جانا چاہیے۔

باتھ روم کے جوتے ہمیشہ الگ سے رکھیں۔ان کو بیڈروم یا گھر میں پہن کر نہیں پھرنا چاہیے۔

صابن استعمال کرکے اس پہ جھاگ بنا کر مت چھوڑیں۔صاف ستھرا اور خشک کرکے رکھنا چاہیے۔

باتھ روم کا دروازہ کبھی دستک دیے بغیر نہ کھولیں ہوسکتا ہے کوئی باتھ روم میں ہو اور کنڈی لگانا بھول گیا ہو۔

کموڈ کے استعمال میں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔کپڑوں اور جسم کو چھینٹوں سے بچانا چاہیے نیز بیٹھنے سے قبل ٹنکی سے پانی ضرور بہادیں۔اُٹھ کر فلش ضرور کریں اور ہاتھ صابن سے دھوئیں۔

میں بھی یہی سمجھ رہی تھی کہ میں آئینہ دیکھ رہی ہوں مگر مجھے اس تصویر میں نو فرق نظر نہیں آ رہے ہیں۔

کیا آپ کو نظر آ رہے ہیں؟

دل کی باتیں......کام کی باتیں

پروفیسر حکیم سید مجاہد محمود برکاتی
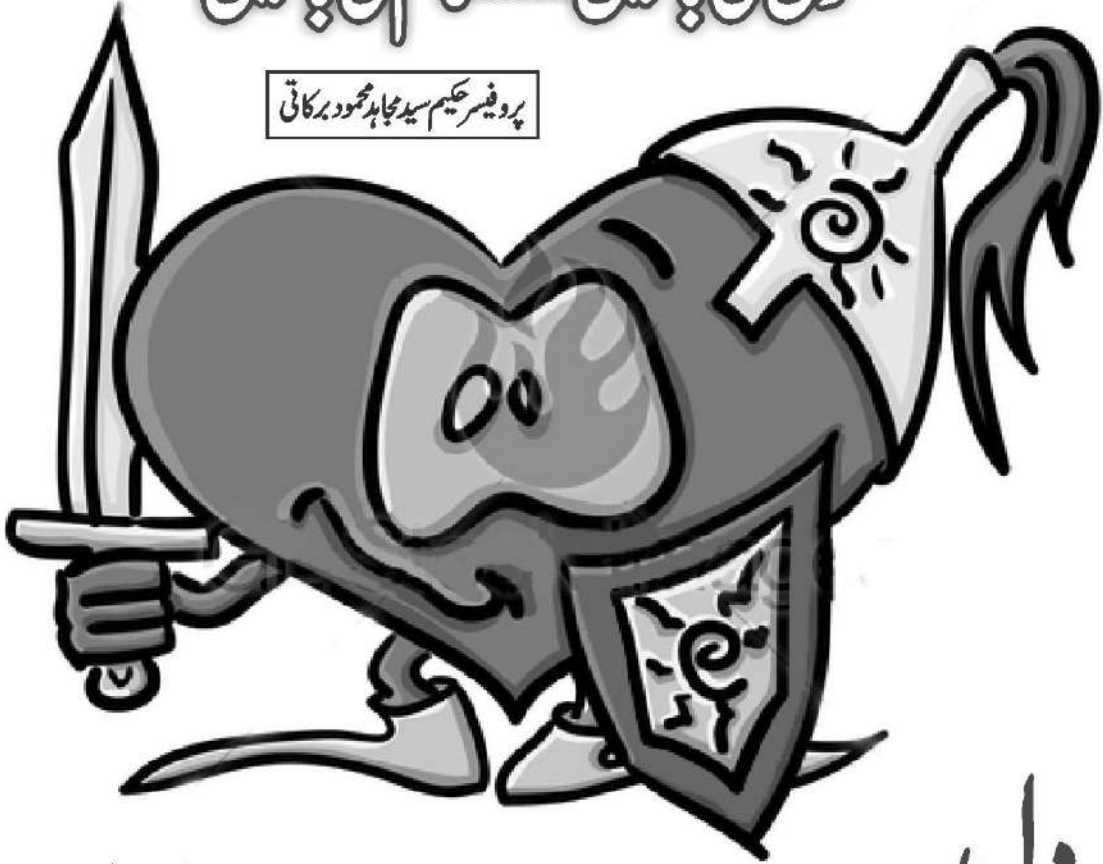
دل سر چشمہ حیات ہے۔ ارسطو نے کہا تھا: دل کی حرکت کا نام زندگی ہے اور بابائے طب بقراط کے ہاں دل کی رگوں، صمام اور حجروں کا ذکر ملتا ہے۔ تین ہزار سال قدیم چینی صحیفوں میں خون کے، رگوں میں بہنے اور کبھی نہ رکنے کا ذکر ملتا ہے۔ قدیم مصری مرنے والوں کو حنوط کر کے محفوظ کر لیتے تھے۔ ان کو دل سے نکلنے والی رگوں کا علم تھا۔ آج سے پانچ ہزار سال قبل کے سائنس دان بھی دل کو سر چشمہ حیات کہتے تھے۔ یونانی عہد کے رومیوں کا دور آیا۔ رومی طب کے سرخیل جالینوس جس کا زمانہ ڈھائی ہزار سال پہلے کا ہے، اس نے بھی دل میں خون کی روانی کو ثابت کیا ہے۔ دل ایک طرح کا پمپنگ اسٹیشن ہے جو سارے جسم کو اس کی ضرورت کے مطابق خون پہنچاتا ہے۔ ایک زوردار ضرب (قوت) سے اخراج ہوتا ہے۔ ایک ضرب میں 60 سے 70 ملی لیٹر خون رگوں میں داخل ہوتا ہے۔ اس ضرب کو ہم دل کی دھڑکن کہتے ہیں۔ جس طرح کسی کار کو چلانے کیلیے پیٹرول کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح ہمارے دل کا ایندھن آکسیجن آمیز خون ہے۔ حرکتِ قلب کا نام ہی زندگی ہے۔ یہ حرکت بند ہوئی اور حضرتِ انسان یہاں

سے وہاں پہنچ گئے۔ عارضۂ قلب ہر قوم، طبقہ، جنس اور عمر میں ہوتا ہے، خصوصاً ترقی یافتہ دنیا میں یہ موت کا اہم سبب ہے۔

ابھی تک ترقی پزیر ممالک میں ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں اس کی شرح کم ہے۔ ایک اندازہ ہے کہ 2020ء تک ترقی پزیر ممالک میں بھی یہ موت کا اہم سبب ہو جائے گا۔ امریکہ کی قلب کی انجمن کا کہنا ہے کہ ان کے عوام میں بھی اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ دل کے امراض کا علاج کراسکیں۔

عارضہ قلب کی ایک بڑی وجہ بلند فشار خون (ہائی بلڈ پریشر) بھی ہے جسے خاموش قاتل بھی کہتے ہیں۔ بلند فشارِ خون کا تعلق ہمارے جدید طرزِ زندگی سے بھی ہے۔ طبیعت میں عجلت، ہیجان، تناؤ، اضطراب، بسیار خوری اس کے اہم اسباب ہیں۔ بعض اوقات پتا ہی نہیں چلتا اور یہ خاموشی سے اپنا کام کر جاتا ہے۔ گردے کے امراض سے بھی دل کے پٹھے اور دل کے ہجرے بڑے ہوجاتے ہیں۔ ایسا دل کمزور ہوجاتا ہے۔ جس کی وجہ سے خون کی رفتار دل، دماغ اور گردوں میں کم ہوجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے دل کو اس طرح بنایا ہے کہ وہ اس حالت میں بھی سال ہا سال برداشت کرتا ہے۔ بلند فشارِ خون بذاتِ خود کوئی بیماری نہیں ہے بلکہ یہ کسی مرض کی علامت ہوتی ہے۔ اس کو کس طرح قابو میں کریں؟ اگر کسی کو یہ تکلیف ہو جائے تو پھر یہ دوستی زندگی بھر چلتی ہے۔

فشارِ خون کے مریضوں کو بلڈ پریشر کا آلہ گھر پر رکھنا چاہیے اور دن کے دو مختلف اوقات میں بلڈ پریشر نوٹ کرنا چاہیے۔ گاہے بگاہے اپنے معالج سے بھی چیک کروانا چاہیے۔ کمی بیشی کے ساتھ ادویہ کا استعمال رکھنا چاہیے۔

سرخ رگوں کی بندش دل (ARTERIOPLOCE) کی شہرہ آفاق بیماری ہے۔ شہروں میں اس کے مریضوں سے اسپتال بھرے ہوئے ہیں۔ اس مرض میں سرخی تاجی رگوں میں سختی آجاتی ہے۔ ان رگوں میں خون کی گردش کم ہونے لگتی ہے تو انجائنا کی تکلیف ہوتی ہے اور جب ان رگوں میں خون بالکل تھم جائے یا رک جائے تو حملہ قلب ہوتا ہے۔

دل کی بیماریاں بیسویں صدی کا شاخسانہ ہیں۔ آج دیہاتوں کے مقابلے میں شہروں میں رہنے والوں میں اس مرض میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔

میرے استاد شہید پاکستان حکیم محمد سعید کہتے تھے "الحمد اللہ میں نے کوئی دوا نہیں کھائی اور نہ کھانے کی کوشش کرتا ہوں اور نہ ہی کسی کو دوا کھلانا مجھے پسند ہے۔ دوا تو آخری چیز ہے، پہلے تدبیر اور غذا ہے، یہ ناکافی ہو جائیں تو دوا کرنی چاہیے"۔

اللہ پر بھروسے، قناعت، اطمینان، سادگی اور فطرت کی طرف واپسی سے ایسے امراض پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

اپنی صحت کو مناسب حالت میں برقرار رکھنا ہر فرد کا فرض اولین ہے اور اس غرض سے اچھی عادات کو اختیار کرنا چاہیے۔ اچھی عادات صحت میں یہ ضروری ہے کہ ناشتہ اچھی طرح کیا جائے، روزانہ مناسب ورزش کی جائے، رات کو مناسب وقت کے لیے نیند لی جائے اور ممکن ہو تو دن میں ستانے کے وقت بھی نکالا جاسئے۔ جو لوگ ان احتیاطوں پر عمل پیرا ہوں گے وہ نہ صرف اپنے رشتہ حیات کو مضبوط کریں گے بلکہ شاہراہ زندگی کو زیادہ سبک روی سے طے کریں گے اور زیادہ عرصہ اس کارگاہ حیات میں رہیں گے۔

ہمارا جسم بہ نسبت دیگر مشینوں کے، زیادہ پیچیدہ، زیادہ نازک اور زیادہ قیمتی ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ہر دم چوکنا رہیں اور یہ دیکھتے رہیں کہ کوئی شے ہماری جسم کو اور ہماری صحت کو تباہ تو نہیں کر رہی اور کیا ہماری دفاعی صلاحیتوں کو کم کر رہی ہے؟ ہمیں ان اشاروں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جو ہمیں یہ بتائیں کہ ہماری صحت ایسی نہیں ہے، جیسی کہ ہونی چاہیے۔ اگر آپ کو اپنی صحت کے متعلق شبہ ہے تو آپ کو چاہیے کہ اپنے طرز زندگی پر نظر ثانی کریں اور اس میں مناسب تبدیلیاں کریں اور یہ بھی سوچیں کہ کہیں آپ کو طبی مشورہ کی ضرورت تو نہیں ہے۔ روایتی طور پر پڑھے لکھے لوگ بھی معلومات صحت سے کس قدر بیگانہ ہوتے ہیں۔ دنیا کے اکثر ممالک میں لوگوں کو اپنی صحت کے متعلق کوئی خاص علم نہیں ہے۔ ان کو بھی نہیں جو اپنے آپ کو تعلیم یافتہ سمجھتے ہیں۔ جس خطہ ارضی میں ہم قیام پذیر ہیں وہاں توہمات، غلط عقائد اور لاعلمی کی وجہ سے حالات کچھ زیادہ ہی ابتر ہیں۔ جن لوگوں کو تھوڑی بہت معلومات حاصل ہیں، ان کی اکثریت بوجوہ ان پر عمل کرنے سے قاصر ہے۔ یہ اکثر لوگوں کو معلوم ہے کہ وزن کو مناسب رکھنا اور ورزش کرنا صحت کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے لیکن کتنے لوگ اس پر عمل پیرا ہیں، حالانکہ اچھی عادتیں ایک بار ڈال لی جائیں تو ان پر باعمل رہنا عادت ثانیہ بن سکتا ہے اور اب ان کو ترک کرنا مشکل ہے لیکن اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ عادتیں خود ہماری اپنی مصنوعی طریقے پر ڈالی ہوئی ہیں، جن کے ہم خود بعد میں تابع ہو کے رہ جاتے ہیں اور پھر یہ بھی تمیز نہیں رہتی کہ صحیح عادت کیا ہے اور غلط کیا۔

عزیز نوجوان ساتھیو! ان صفحات پر ہم آپ کی مشکلات، تکالیف اور بیماریوں کے حوالے سے آپ کے سوالوں کے جواب دیا کریں گے۔ آپ ہم سے بذریعہ ای میل، بذریعہ سیل فون اور بذریعہ ماہنامہ ساتھی رابطہ کر سکتے ہیں۔

s.mujahid.barkati@gmail.com

بھیڑ فارم ہاؤس جانا چاہتی ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ راستہ بھول گئی ہے۔ کیا آپ اس بھیڑ کی مدد کر سکتے ہیں۔

بنٹی اور مشن اسکواڈ

محمد ندیم اختر

اس وقت جنگل میں خرگوشوں کی بستی کے تمام خرگوش ایک جگہ جمع تھے۔ بنٹی خرگوش اُونچا بول رہا تھا۔ اس نے اچانک ایک ایسی بات کی کہ سب خرگوش اپنی جگہ سے اچھل پڑے۔ انھیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ کس طرح ممکن ہے۔

''کیا کہا...... تم نے بنٹی!''

''ایسا کیا کہہ دیا کہ تم سب ہکا بکا ہو گئے ہو۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟''
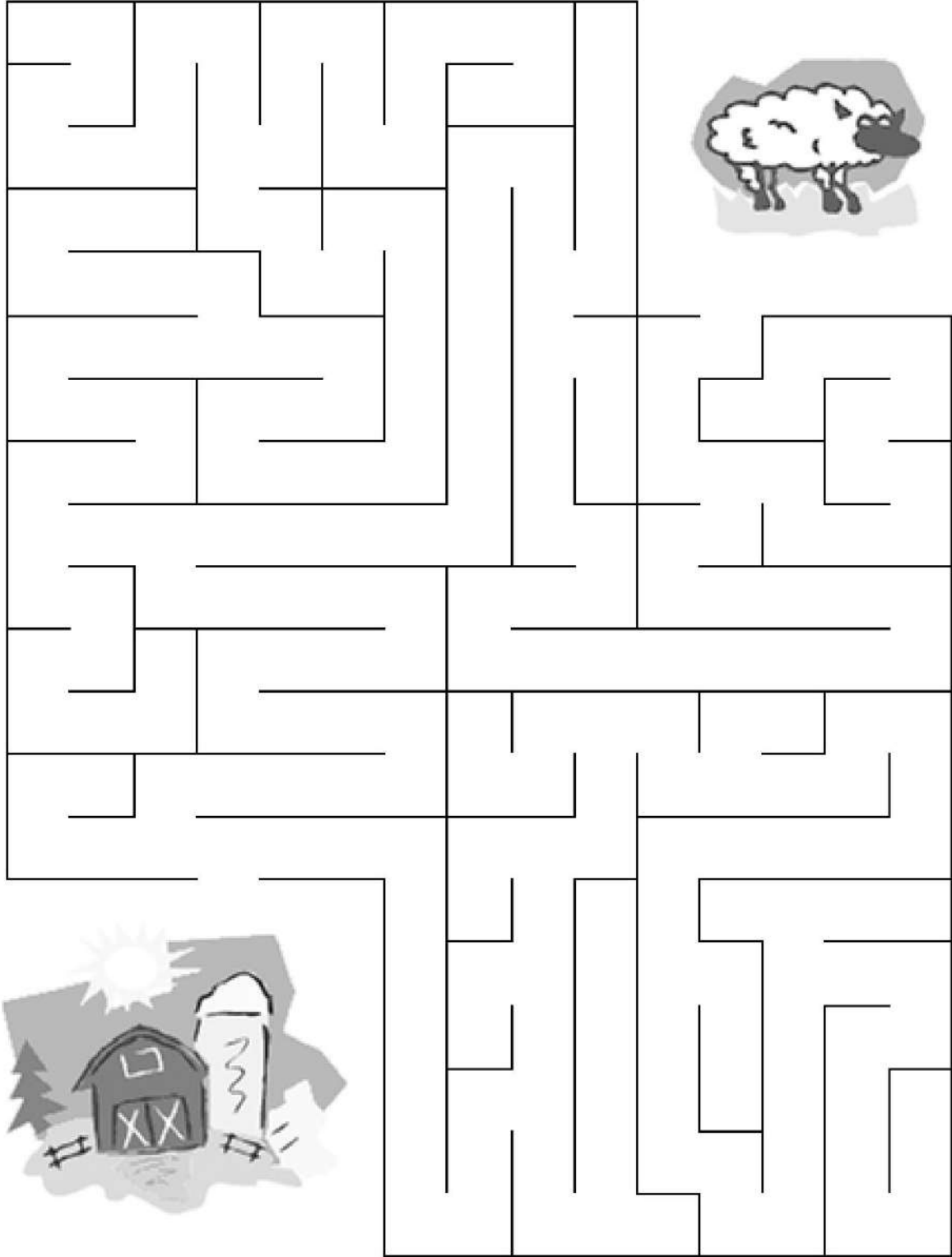
''کیوں نہیں ہے ممکن؟''

''اس لیے کہ انھیں تو کافی عرصہ ہو گیا ہے ہم سے بچھڑے ہوئے۔''

''اس میں کون سی بڑی بات ہے...... ہمارے جو ساتھی کافی دنوں سے غائب ہیں...... وہ کھیت کے مالک کی قید میں ہیں اور زندہ ہیں۔''

''تمھیں کیسے پتا چلا؟''

''لو جی! یہ بھی کوئی کرنے والی بات ہے...... آپ کو تو

پتا ہی ہے کہ میں اپنے دوست جیکی کے ساتھ مل کر لال لال گاجریں کھانے کے لیے جنگل سے باہر گیا......
ہمارا ارادہ چوری کا تھا...... ہمیں کیا پتا تھا......''
''کیا پتا تھا......؟''
''یہی کہ کھیت کے مالک نے وہاں لوہے کے شکنجے لگا رکھے ہیں...... جیکی تو خوش قسمتی سے بچ گیا، لیکن میرا پاؤں ایک شکنجے میں پھنس گیا...... میں خود کو آزاد نہ کروا سکا...... جیکی نے بھی میری کوئی مدد نہ کی، کیوں کہ اسے اپنا خطرہ تھا، وہاں جا بجا شکنجے لگے ہوئے تھے...... اس لیے یہ بھاگ گیا...... اتنے میں کھیت کا مالک آیا، تو اس نے مجھے وہاں سے نکالا اور اپنے گھر لے جا کر قید کر دیا...... وہاں میری ملاقات اپنے گم شدہ ساتھیوں سے ہوگئی۔''
''اچھا! یہ بتاؤ کہ تم وہاں سے آزاد کیسے ہوئے؟''
''میں نے مالک کی بیٹی عبیرہ سے دوستی کر لی...... آہستہ آہستہ اسے اپنے اعتماد میں لیا اور ایک دن اسے دھوکا دے کر نکل آیا...... اس دھوکے کا مجھے بہت افسوس ہے، کیوں کہ عبیرہ بہت پیاری اور معصوم سی بچی تھی، لیکن میں اس کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔''
بنٹی کے آنے کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ اس کے ماں باپ تو خوش تھے ہی، لیکن جن کے بچے گم ہو چکے تھے، انھیں جب اس بات کا پتا چلا کہ وہ زندہ ہیں اور مالک کی قید میں ہیں، تو سب بہت خوش ہوئے۔

اب سب خرگوش بنٹی سے ملنے آئے ہوئے تھے۔
جب سے جنگل میں خرگوشوں کی بستی میں یہ بات معلوم ہوئی کہ ان کے گمشدہ خرگوش زندہ ہیں اور جنگل سے باہر گاجروں کے کھیت مالک کے گھر قید بند کی مشکلات جھیل رہے ہیں، تو اسی دن سے ان کی بستی میں ایک نئی بحث کا آغاز ہوگیا۔
ایک دن بستی کے تمام بوڑھے خرگوش سر جوڑ کر بیٹھے تھے۔
''آخر ہم اپنے قیدی بچوں کو رہا کیسے کروائیں؟''
''اس میں قصور اس کھیت مالک کا نہیں ہے۔''
ایک بوڑھے خرگوش نے کہا، تو سب چلا اُٹھے۔
''واہ! کیا بات ہے آپ کی...... پھر قصور ہمارا ہے...... آپ بوڑھے ہوگئے ہیں۔''
''پہلے میری بات تو سن لو۔''
''فرمائیں!''
''قصور ہمارا ہے کہ ہم اپنے بچوں کو انسانوں کے کھیتوں میں جانے سے منع کیوں نہیں کرتے، ہمارے خاندان کے اکثر خرگوش اسی طریقے سے چوری چکاری کرتے تھے، اب بھی کچھ خرگوش گاجریں چوری کر کے کھاتے ہیں، سنا ہے۔''
''کیا سنا ہے؟''
''سنا ہے کہ اب تو زمانہ بھی بدل گیا ہے، اس لیے ہمیں بھی اب ایسے کاموں سے پرہیز کرنا چاہیے''۔

بوڑھے خرگوشوں میں سے ایک خرگوش بولا۔
''ہم ہمیشہ سے معصوم اور بے ضرر جانور مانے جاتے ہیں، ہم اس جنگل کے رہنے والے تمام جانوروں میں سب سے زیادہ معصوم ہیں۔ ہم پودوں کی تازہ کونپلیں کھاتے ہیں، ہری ہری گھاس کھاتے ہیں اگر کبھی کبھی لال لال گاجریں کھانے کو دل کر ہی لیتا ہے، تو اس میں حرج کیا ہے...... کیا ہم اپنے باپ دادا کی روایات کو بھسم کر دیں کہ زمانہ بدل گیا...... کیا ہم معصوم اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کا بھی گلا گھونٹ دیں۔'' ایک خرگوش بول اُٹھا۔
''میرا قطعی طور پر یہ مطلب نہیں تھا...... میں تو بس اتنا کہنا چاہتا تھا کہ ہمارے بادشاہ سلامت بہت اچھے ہیں، اُنھوں نے جنگل کے تمام جانوروں کے لیے جنگل میں اسکول قائم کیا ہے...... اگر آپ کو یاد ہو، تو''
''کیا یاد ہو؟''
''کہ بھالو میاں دو بار ہماری بستی میں آ کر تعلیم کی اہمیت سے آگاہ کر کے گئے ہیں لیکن ہم نے کبھی ان کی بات پر توجہ دی ہے۔ اسکول میں تعلیم کے ساتھ ساتھ زندگی گزارنے کی مہارتیں بھی دی جاتی ہیں...... اب تو سنا ہے کہ اسکول میں شیر کو درخت پر چڑھنے کا ہنر بھی سکھایا جاتا ہے...... اسی طرح اُلو کی بی بتا رہی تھیں کہ اب تو اسکول میں اُلو کے بچوں کو دن میں اُڑنے کا ہنر بھی سکھایا جا رہا ہے...... اسی وجہ سے دور کے سفید فاموں کے جنگلوں میں عقل مند کی نشانی اُلو سمجھا جانے لگا ہے، جب کہ ہم ابھی تک اُلو کو نحوست کی علامت سمجھتے ہیں۔''
اس بوڑھے خرگوش کی باتیں سن کر بنٹی کے ابو بولے۔
''اس کا مطلب ہے کہ ہم بھی اپنے بچوں کو اسکول بھیجیں تاکہ وہ تعلیم حاصل کر کے جہاں شعور حاصل کریں، وہاں زندگی گزارنے کی مہارتیں بھی حاصل کر سکیں۔''
''جی ہاں! بلکہ ہم ہیڈ ماسٹر صاحب سے بات کریں گے کہ زندگی گزارنے کی مہارتوں کے ساتھ ساتھ ہمارے بچوں کو یہ ہنر بھی سکھائیں کہ اگر وہ غلطی سے کسی انسان کی قید میں آ بھی جائیں، تو وہاں سے کیسے بچ کر واپس اپنی بستی میں آ سکتے ہیں۔''
یہ بات سن کر سب بوڑھے خرگوشوں کے چہروں پر ایک انجانی سی خوشی پھیل گئی۔ اس طرح پوری بستی میں یہ بات پھیل گئی کہ بستی کے سارے معصوم خرگوش 'اسکول' میں داخل ہوں گے۔ اگلے دن بستی کے سارے معصوم خرگوش اپنے اپنے والدین کے ساتھ جنگل میں ندی سے پار 'اسکول' کی جانب جا رہے تھے۔ ندی پار کرانے کے لیے کچھوؤں کی ایک فوج ندی کے کنارے پر موجود تھی۔ جنگل کے بادشاہ نے کچھوؤں کی ذمہ داری لگائی تھی کہ اسکول آنے والے بچوں کو صبح سویرے وہ ندی پار کرایا کریں گے اور چھٹی

کے وقت بھی وہ اپنی ذمہ داری نبھائیں گے۔ اس طرح بنٹی، جیکی اور ان کے دیگر دوستوں کا داخلہ ہوگیا۔

بنٹی سمیت بستی کے تقریباً سارے خرگوش دل جمعی سے پڑھتے تھے جب کہ جیکی کی عادتیں نہیں بدلی تھیں، لیکن بنٹی نہیں چاہتا تھا کہ وہ جیکی سے دور ہو جائے۔ اس طرح جیکی مزید بگڑ سکتا تھا، اس لیے بنٹی اسے اپنے ساتھ رکھتا۔

وقت گزرتے کب دیر لگتی ہے۔ ایک سال بھی مکمل ہو گیا۔ اسکول میں اساتذہ نے پہلا قاعدہ مکمل کرانے کے ساتھ ساتھ اُنھیں جہاں زندگی گزارنے کی مہارتیں دی تھیں۔ وہیں اُنھیں کسی بھی مشکل حالات میں پھنسنے کی صورت میں ان سے نبرد آزما ہونے کی تربیت بھی دی تھی۔

ایک سال مکمل ہونے کے بعد بستی کے بوڑھے خرگوش ایک بار پھر اکٹھے ہوئے۔ اس بار بوڑھے خرگوشوں کے ساتھ بستی کے وہ تمام بچے خرگوش بھی شریک تھے، جو جنگل کے اسکول میں زیرِ تعلیم تھے۔

''ہم لوگ اب تیار ہیں۔''

بچے خرگوشوں کی بات سن کر بوڑھے خرگوش بولے۔

''کس لیے؟''

''اب ہم اپنے ساتھیوں کو کھیت کے مالک سے آزاد کرانے کی تربیت لے چکے ہیں، اس لیے اب ہم 'مشن اسکواڈ' کے لیے تیار ہیں۔''

''ٹھیک ہے...... تیاری کرو۔''

پہلے مرحلے میں بستی کے بوڑھے خرگوشوں نے 'مشن اسکواڈ' میں تین نام چنے...... جن میں بنٹی، جیکی اور نونی شامل تھے۔ منصوبے کے مطابق اگلے دن صبح ان تینوں نے کھیت کے مالک کے گھر تک پہنچ کر ڈیڑھ سال سے قید بستی کے خرگوشوں کو آزاد کرانے کی کوشش کرنا تھی۔ بنٹی کو 'مشن اسکواڈ' کا لیڈر بنایا گیا جب کہ جیکی اور نونی نے اپنے لیڈر کے ہر حکم کی تعمیل کرنا تھی۔ بنٹی اپنے مشن کو ہر طور پر کامیاب کرنے کے لیے پرجوش تھا۔

اگلے دن وہ منصوبے کے مطابق اپنے والدین اور بستی والوں کی دعاؤں کے ساتھ مشن پر روانہ ہوئے۔ جنگل سے نکل کر جیسے ہی وہ گاجروں کے کھیت کے قریب پہنچے، تو گاجروں کی بھینی بھینی خوشبو نے ان کی توجہ اپنی طرف موڑ لی۔ بھاگتے بھاگتے ایک لمحے کو وہ کھیت کے کنارے رک گئے۔ جیکی نے مسکراتے ہوئے بنٹی سے کہا۔

''بنٹی! ابھی سورج نہیں نکلا۔''

''تو پھر؟''

''اس لیے کھیت کا مالک اپنے گھر موجود ہوگا...... ہمارے منصوبے کے مطابق جب کھیت کا مالک گھر سے باہر ہوگا، تو ہم اپنے مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے

میں کھیت مالک کے گھر میں قدم رکھیں گے ...... اتنی دیر اسی کھیت کے ساتھ رک کر تھوڑا آرام کرلیں۔"

جیکی کی بات میں وزن تھا، اس لیے بنٹی اور نونی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ انھیں وہاں رُکے ہوئے ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ گاجروں کی بھینی بھینی خوشبو ان کے منہ میں پانی لے آئی۔ ایک لمحے کے لیے تو بنٹی کا دل بھی للچایا، لیکن دوسرے ہی لمحے اسے ایک سال پہلے کا واقعہ یاد آ گیا جب وہ چوری کی نیت سے میٹھی میٹھی اور لذیذ گاجریں کھانے اسی کھیت میں داخل ہوا تھا۔ گاجریں کھاتے ہوئے لوہے کے شکنجے میں پھنس گیا تھا اور کھیت مالک نے سزا کے طور پر اسے اپنے گھر میں قید کر لیا تھا۔ جیکی نے مسکراتے ہوئے بنٹی سے کہا۔

"اگر آپ اجازت دیں، تو کھیت کے کنارے سے گاجریں کھالوں۔"

"تمھیں پچھلے سال کا واقعہ یاد نہیں ...... اب پھر یہ غلطی نہیں کرنی ہے۔"

"ہم کھیت کے اندر تک نہیں جاتے بلکہ کنارے سے ہی ایک ایک گاجر کھا لیتے ہیں اور آپ کے لیے کچھ گاجریں لے آتے ہیں ...... اتنی دیر میں آپ نظر رکھیں کہ کہیں کھیت کا مالک ہی نہ آن پہنچے ...... کنارے پر کون سا شکنجہ لگایا گیا ہوگا۔"

جیکی کی بات میں وزن تھا۔ مشن اسکوارڈ کے لیڈر بنٹی نے جیکی اور نونی کو اجازت دے دی۔ بنٹی وہیں کھڑا ہو کر جیکی اور نونی کو کھیت کے کنارے سے اندر قدم رکھتے ہوئے دیکھنے لگا۔ اس کے خیالوں میں میٹھی میٹھی لذیذ گاجریں تھیں۔

اچانک اسے جیکی کی چیخ سنائی دی۔ ابھی بنٹی چیخ کی سمت کا اندازہ ہی کر رہا تھا کہ نونی کو کھیت سے نکلتے اور جنگل کی جانب بھاگتے دیکھا۔ بھاگتے بھاگتے وہ کہہ رہا تھا۔

"جیکی کا پاؤں لوہے کی شکنجے میں پھنس چکا ہے۔"

بس یہ سننا تھا کہ بنٹی نے بھی جنگل کی جانب چھلانگ لگائی۔ چھوٹے سے لالچ نے ان کے مشن کو ناکام بنا دیا تھا۔ مشن اسکوارڈ کا پہلا منصوبہ ہی ناکام ہو گیا تھا۔ بھاگتے بھاگتے بنٹی کو اپنے استاد کی بات یاد آ رہی تھی۔

"جیسے انسان ہمیشہ لالچ میں آ کر اپنا نقصان کرتا ہے، ایسے ہی جب بھی کسی مشن پر روانہ ہو، تو اس میں کبھی لالچ کا عنصر غالب نہ آنے پائے...... کیوں کہ لالچ بری بلا ہے ...... لالچ تو بڑے سے بڑے مضبوط انسانوں کو بھی ناکامی کا منہ دیکھنے پر مجبور کر دیتی ہے ...... ہم تو پھر معصوم اور کمزور سے جانور ہیں ...... یہ لالچ ہمارا تو برا حشر کر دے گی۔"

اب بنٹی پچھتا رہا تھا کہ اس نے اپنے استاد کی اتنی بڑی بات کو کیوں بھلا دیا تھا۔

☆......☆

اُف یہ آپا عطرت

فوزیہ خلیل

"یہ سالن میں کیا تیر رہا ہے آپا" ابو ہکلائے

تین دن ہو گئے تھے امی کا بخار کسی طرح اُترنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ چچی جان کی والدہ بیمار تھیں لہٰذا چچی جان وہاں گئی ہوئی تھیں ورنہ وہ کچن کے کاموں میں امی کا ہاتھ بٹایا کرتی تھیں۔ اب تو امی کے لیے گھر کے کام کرنا بہت ہی مشکل ہو گیا تھا۔ وہ بالکل اکیلی ہو گئی تھیں۔

اس شام میں بازار سے روٹیاں خرید کر گھر لوٹ رہا تھا کہ میں نے ٹیکسی سے کچھ لوگوں کو اُترتے دیکھا۔ آپا عطرت اور ان کے شوہر کے علاوہ دو بوڑھے مرد و عورت بھی تھے یعنی کل چار افراد۔ میرا دل تو دھک سے رہ گیا اب تو امی مہمان داری کرنے کے قابل بھی نہیں۔ کتنی مشکل ہوگی اب مہمان نوازی میں۔

"میری امی تو کئی روز سے بیمار ہیں۔" میں نے سلام کرنے کے بعد کہا۔

"اے لو۔ کیسی بات کرتے ہو لڑکے ہم تو عیادت کو آئے ہیں۔" آپا عطرت نے مسکرا کر کہا۔ پھر وہ اور

ان کے میاں مڑ کر ٹیکسی میں سے اپنے بستے اتارنے لگے۔ ''عیادت کے لیے آنے کے لیے کئی بستوں کی ضرورت تو نہیں پڑتی۔'' میں سوچ رہا تھا۔ آپا عطرت نے بہت مسکرا کر کہا۔ پھر وہ اور ان کے میاں مڑ کر ٹیکسی میں سے اپنے بیگ اتارنے لگے۔

آپا عطرت، ابو اور چچا جان کی کوئی دور پرے کی رشتہ دار تھیں ان کے میاں بہت کم ہی ان کے ساتھ آتے تھے۔ وہ خاندان بھر میں نہن خالو کہلاتے تھے۔

''اس مرتبہ تو آپا عطرت ساتھ اپنے ساس اور سسر کو بھی لائی ہیں۔'' میں نے امی کے کمرے میں جھانک کر کہا۔

امی جلدی سے اٹھ کر باہر کو لپکیں: ''ارے سلمیٰ...... سوئی پڑی تھیں کیا تم۔'' آپا عطرت بولیں۔

''جی بس...... لیٹی ہوئی تھی۔''

''ارے...... عین عصر کے وقت لیٹنا تو بڑی نحوست ہے۔ بہوئیں تو بس کام کرتی اچھی لگتی ہیں۔ کام اور بس کام۔'' ساس صاحبہ فوراً بولیں۔

''ہاں ...... بہو نہ ہوگئی۔ قائداعظم ہوگئی۔'' میں نے دبی آواز میں کہا۔

ساس صاحبہ نے مجھے گھور کر دیکھا پھر بستر پر لیٹتے ہوئے بولیں۔ ''اے لو۔ جب تک کھانا تیار ہوتا ہے۔ کچھ ہلکا پھلکا کھانے کو دے دو۔''

''اری سلمیٰ۔ میں اپنی ساس کو خوب پیٹ بھر کر کھانا کھلا کر لائی ہوں تم بُرا نہ ماننا۔ بس ان کی یادداشت خراب ہے۔ کھانا کھا کر بھول جاتی ہیں اور بار بار مانگتی ہیں۔'' آپا عطرت بولیں۔

''ان کی یادداشت خراب ہے مگر ہماری تو نہیں ہے۔ کھانا تو اپنے ٹائم پر ہی لگتا ہے یہاں۔'' میں نے فوراً کہا۔

امی نے مجھے گھور کر دیکھا اور باہر نکلنے کا اشارہ کر دیا۔

ذرا دیر بعد میں نے جھانکا تو امی کچن میں مصروف تھیں۔ کچن سمیٹتی جا رہی تھیں۔ ساتھ برتن بھی دھو رہی تھیں۔

''امی میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں۔'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔ تمھارے ٹیوٹر آنے والے ہیں تم پڑھنے بیٹھ جاؤ۔''

ابھی میں مڑنے کو تھا کہ ساس صاحبہ کچن میں چلی آئیں اور مسکراتے ہوئے بولیں۔

''بہت آواز آ رہی تھی برتنوں کی۔ کیا کیا پکا رہی ہو آج۔ اگر کچھ تیار ہو گیا ہے تو ذرا پلیٹ میں ڈال کر دے بھی دو۔''

''اب۔ ابھی۔ تو میں برتن دھو رہی تھی۔'' امی نے جواب دیا۔

''اے لو سلمیٰ۔'' پیچھے سے آپا عطرت کی آواز آئی۔

''اری سلمیٰ۔ میں سالن اور روٹیاں تو ساتھ پکا کر لائی ہوں۔ بیمار کی عیادت کرنے میں تو خاندان بھر میں مشہور ہوں۔ ابھی جب میز پر کھانا لگے گا تو میں بھی اپنے ساتھ لائے سالن اور روٹیاں نکالوں گی۔''

''اچھا۔'' میں خوش ہو کر بولا۔ ''پھر امی کو کچھ پکانے کی تو ضرورت نہیں ہے۔''

''لڑکے۔تم دوسروں کے معاملات میں بہت ٹانگ اَڑاتے ہو۔ جاؤ کسی کام دھندے سے لگو۔'' آپا عطرت نے چڑ کر مجھ سے کہا۔ پھر وہ کچن تک گھسٹتی ہوئی اپنا بیگ لے کر آئیں۔ دس بارہ جوڑے باہر نکالنے کے بعد ایک چھوٹی سی ڈھکنے والی کٹوری اندر سے برآمد ہوئی۔

''یہ لو سلمیٰ۔ سالن ہے یہ چکن کا۔''

پھر دوبارہ اپنے بیگ کی طرف متوجہ ہوئیں۔ بوسیدہ سے رومال میں کچھ لپٹا ہوا تھا۔ ''یہ لو۔ روٹیاں بھی ساتھ ہی لائی ہوں۔لو۔ سنبھالو۔ یہ سارے کھانے۔'' آپا عطرت نے بہت مسکرا کر کہا۔

''سس سارے کھانے۔'' میں نے ہکلا کر کہا اور باہر نکل گیا۔

☆......☆

کھانا لگ چکا تھا۔ امی مجھے آواز دے رہی تھیں۔ آپا عطرت، ببن خالو، ان کی ساسی، سسر سب ہی تھے۔ میری دادی بھی تھیں اور ابو بھی آفس سے آ چکے تھے۔ امی نے کئی طرح کے سالن بنائے تھے۔

''اے لو۔ مظہر۔ یہ سالن تو دیکھا ہی نہیں تم نے۔'' آپا عطرت نے بڑے لاڈ سے ابو سے کہا۔ ''اور یہ روٹیاں بھی تو لو۔'' انھوں نے میلا رومال کھولنا شروع کیا۔

''یہ روٹیاں گول کیوں نہیں ہیں۔'' ابو حیران ہو کر بولے۔

''لو بھیا۔ دنیا کہاں کی کہاں پہنچ گئی۔ یہ گول روٹی کے چکر میں پڑے ہیں۔ ارے روٹی گول نہیں ہوگی تو کیا حلق سے اُتاری نہ جائے گی اصل میں مظہر کو بچپن سے جیومیٹری کا شوق تھا۔ ابھی تک گول، چوکور اور تکون کے چکر میں رہتا ہے۔'' آپا قہقہہ لگا کر ہنسیں اور پھر اپنی ڈھکنے والی کٹوری آگے لڑھکا کر بولیں۔

''یہ لو۔ نئے طریقے سے چکن بنائی تھی۔ تم لوگوں کے لیے۔''

''یہ۔ یہ سالن میں کیا تیر رہا ہے آپا۔'' ابو ہکلائے۔

''اے لو مظہر۔ اتنے بڑے ہو گئے ہو۔ ابھی تک ننھے منے کیڑے مکوڑوں سے ڈرتے ہو۔ حد ہو گئی۔ اب اس سالن میں کوئی اُڑنے والا لال بیگ گر گیا تو ایسا کیا گھبرانا۔ ارے میاں کوئی شیر تو نہیں نکل آیا سالن میں سے۔'' آپا عطرت نے پھر قہقہہ لگایا۔ اچانک انھیں کچھ یاد آیا تو فوراً بولیں۔

''سنتے ہو مظہر۔''

''جی آپا۔ کہیے سن رہا ہوں۔'' ابو نے جواب دیا۔

''اے بھیا۔ کل مجھے اپنی رضیہ کے گھر جانا ہے۔ تم لے چلنا۔''

''مگر آپا کل میں آفس سے چھٹی نہیں کر سکتا میرا آفس میں آڈٹ چل رہا ہے۔ آج کل۔''

''اے بھیا۔ ہم تو کبھی تمھاری خوشامد نہ کرتے۔ رکشے میں چلے جاتے۔ مگر ہم کو رکشہ کی آواز سے بڑی ہیبت ہوتی ہے۔ لگتا ہے قیامت آ گئی ہے سنا ہے قبرستان میں مردے بھی اُٹھ بیٹھتے ہیں یہ آواز سن کر۔'' آپا عطرت بولیں۔

''آپا۔ آپ لوگوں کے پاس بھی تو ایک گاڑی ہے۔''

میں بولا۔
''کیا پیٹرول نہیں اس میں۔''
''اے لولڑکے۔ ہماری گاڑی کے لیے صرف پیٹرول کا ہونا کافی نہیں۔ بلکہ اس کے چلنے کے لیے عوام کے دھکے اور بزرگوں کی دعائیں اور منتوں کا ہاتھ ہے۔''
آپا نے فوراً جواب دیا۔
''اور۔بب۔بس۔'' میں بولا۔
''لو اور سنو۔ اے لڑکے۔ ہم بس میں بہت بے بسی سے سفر نہیں کر سکتے بس میں بیٹھتے ہی ہمیں احساس کمتری آ گھیرتا ہے۔ چھت سے لے کر باہر کے ڈنڈے تک سے لوگ لٹک رہے ہوتے ہیں اور بس میں جو دردانگیز شاعری لکھی ہوئی ہوتی ہے جا بجا۔ وہ شاعری پڑھ کر تو۔'' آپا عطرت رک کر دوپٹہ کے پلو سے آنسو پونچھنے لگیں۔ ''وہ پڑھ کر تو ہمارا دل اس فانی دنیا میں پھر لگتا ہی نہیں۔''
''یہ مسئلہ تو پھر بڑا گھمبیر ہوگیا ہے۔ مسئلہ کشمیر کی طرح۔'' ممن خالو نے اتنی دیر میں پہلا جملہ ادا کیا۔
''لو۔ ایک تو تم بہت بولتے ہو۔ بس بولے ہی جاتے ہو۔'' آپا ان کی طرف مڑ گئیں۔ یہ تو کھائی ہی نہیں آپ نے۔'' امی نے اس لڑائی جھگڑے سے گھبرا کر کہا۔
''ارے ہاں۔'' آپا مسکرائی اور کھیر کا ڈونگا اپنی طرف سرکالیا۔ کھانا ختم ہونے پر آپا، ممن خالو اور ان کے ساس سسر تو آرام کرنے کے لیے جا لیے اور امی ٹیبل سمیٹنے لگیں۔ پھر تھوڑی دیر بعد میں کسی کام سے کچن میں گیا تو وہ برتن دھو رہی تھیں میں واپس آ گیا۔ تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹہ بعد میں پھر کسی کام سے کچن میں گیا تو وہ کھانا بنا رہی تھیں۔
''امی۔ آپ ابھی تک کام میں ہی لگی ہوئی ہیں۔''
مجھے بہت افسوس ہوا۔
''کوئی بات نہیں۔ چائے بناؤں تمھارے لیے۔''
انھوں نے مسکرا کر جواب دیا۔
''نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ آپ تو پہلے ہی بیمار ہیں اور پھر یہ مہمان......'' میں بولتے بولتے رک گیا۔
''ایک بات نہیں سوچی تم نے۔ پہلے میرا بخار کسی دوا سے بھی نہیں اُتر رہا تھا۔ میں اپنے گھر کے لیے بھی روٹیاں پکانے کے لائق نہیں تھی۔ اور اب ماشا اللہ کئی گھنٹوں سے کچن میں کھڑی ہوں۔ تھکی بھی نہیں۔''
''جی یہ تو ہے۔'' میں نے تسلیم کیا۔ ''آخر یہ کیسے ہوا امی۔''
''بیٹا مہمان خواہ کیسے بھی ہوں۔ وہ اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ اپنے ساتھ رحمتیں اور برکتیں لاتے ہیں۔ ہمارے گھر کی آفات اور بلائیں ان کے ہی دَم سے دور ہوتی ہیں اور اگر آنے والے سفید بالوں والے بزرگ ہوں تو یہ رحمتیں اور برکتیں مزید بڑھ جاتی ہیں۔ جیسا کہ تم خود دیکھ رہے ہو۔ محسوس کر رہے ہو۔ ہے ناں بیٹا۔'' امی نے کہا۔
''جی امی۔ بالکل۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔
اور امی نے جھک کر میری پیشانی چوم لی۔
☆......☆

اردو ادب کی معروف ادیبہ فاطمہ ثریا بجیا رضائے الٰہی سے انتقال کر گئیں

فاطمہ ثریا بجیا یکم ستمبر ۱۹۳۰ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئیں۔ ان کے نانا مزاج یار جنگ اپنے زمانے کے معروف شعرا میں شمار ہوتے تھے جبکہ ان کے والد قمر مقصود حمیدی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے۔ ان کے خانوادے میں زہرا نگاہ، احمد مقصود حمیدی، انور مقصود، سارہ نقوی اور زبیدہ طارق شامل ہیں جو اپنے اپنے شعبوں کے نمایاں افراد میں شمار ہوتے ہیں۔

فاطمہ ثریا بجیا کہنا تھا کہ قلمکار اپنی کاوشوں سے حالات کا رخ بدل سکتے ہیں، پاکستان ہمارا دل ہماری جان ہے۔ ہمارا دل اس کے ساتھ دھڑکتا ہے سو ایسے میں جب اس پر وقت کٹھن ہے تو ہمیں اس کے حال کو سدھارنے میں اپنا کردار ادا کرنا ہوگا اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہمارے ڈراما نگار، صحافی، اور شاعر اپنے قلم سے ثابت کریں کہ ہماری آنکھیں بند نہیں ہیں۔

پاکستان ٹیلی وژن کے لیے لاتعداد ڈرامے سیریل تحریر کیے جن میں اوراق، شمع، افشاں، عروسہ، اساوری، گھر اک نگر، آگہی، انا، کرنیں، بابر اور آبگینے کے نام سر فہرست ہیں۔ حکومت پاکستان نے انھیں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی اور ہلال امتیاز عطا کیا جبکہ حکومت جاپان نے بھی انہیں اپنا اعلیٰ ترین شہری اعزاز عطا کیا تھا۔

ماہنامہ ساتھی اپریل ۲۰۱۵ء میں فاطمہ ثریا بجیا کا انٹرویو شائع ہوا تھا۔

پرانا چور

جب دو چوروں کا آپس میں ٹاکرا ہوا

بلال سہیل

میں نے لان میں نظریں دوڑائیں۔ کوئی میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ اندرونی دروازے کی طرف کھسکنا شروع کر دیا اور پھر جلدی سے اندر داخل ہو گیا۔

اب میرا رخ خالہ کے کمرے کی طرف تھا۔ دراصل آج خالہ کے گھر میں دعوت تھی۔ جس کا انتظام اُنھوں نے لان میں کیا تھا۔

اس قسم کی دعوتیں وہ اکثر کرتی رہتی تھیں۔ کمرے کے دروازے پر پہنچ کر میں نے ہینڈل گھما کر دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ میں ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔

دیوار پر لگی پینٹنگ کو ساتھ رکھی میز پر رکھا، پھر اس جگہ دیوار پر لگے بٹن کو دبایا تو اسی دیوار میں ایک خانہ کھل گیا۔ یہ خانہ ایک دفعہ خالہ نے خود کھول کر دکھایا تھا اور اس کے اندر موجود ہیرے بھی دکھائے تھے۔ میں جھک کر خانے کے اندر دیکھنا ہی چاہ رہا تھا کہ پیچھے سے ایک بھاری آواز گونجی۔ ’’بھئی کیا ہو رہا ہے یہاں پر۔‘‘

میں بوکھلا کر پلٹا تو میری حیرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا کیونکہ میرے سامنے امتیاز کھڑا تھا جو میرے مرحوم خالو کا دوست تھا۔

وہ عمر میں خالو سے کافی چھوٹا تھا لیکن کاروباری رفاقت کی بنا پر دوستی ہو گئی تھی۔ اور امتیاز کے بارے میں اکثر یہ سننے میں آیا تھا کہ اس کا تعلق جرائم سے ہے۔

’’ہاں بھئی، تم نے بتایا نہیں کیا کر رہے ہو۔‘‘ اس نے

شوخ آواز میں کہا۔
''کک......کچھ بھی نہیں۔''
میں نے خفیہ خانے کو اپنی آڑ میں لیتے ہوئے کہا۔
''اچھا یعنی کہ چوری نہیں کر رہے۔'' میں نے اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ محسوس کی۔
''نہیں بھلا میں کیوں کروں گا چوری۔'' میں اب اپنے آپ پر قابو پا چکا تھا اس لیے میں نے اطمینان سے جواب دیا اور اب میں نے خانہ بھی غیر محسوس طور پر دباؤ ڈال کر بند کر دیا تھا۔
''اگر تم چوری نہیں کر رہے تو تم نے ہاتھوں میں دستانے کیوں پہنے ہوئے ہیں، یہ پینٹنگ دیوار سے اتار کر میز پر کیوں رکھی ہوئی ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ دیوار میں ایک بٹن اُبھرا ہوا ہے۔ آخر تم مجھے اتنا بیوقوف کیوں سمجھ رہے ہو۔'' میں اب پورا پسینہ میں شرابور ہو چکا تھا۔
''میں چاہوں تو تمھیں ابھی پکڑوا سکتا ہوں لیکن اس سے مجھے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔''
اس کی آخری بات سن کر میں چونک اُٹھا، اسی وقت اچانک میری نظر اس کے ہاتھوں پر پڑی۔ اس نے بھی داستانے پہن رکھے تھے۔
امتیاز نے بھی شاید میری نظریں پڑھ لیں کہ میں اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہا ہوں وہ بولا: ''اب ہم دونوں جان چکے ہیں کہ ہم ایک ہی مقصد کے تحت اس کمرے میں موجود ہیں۔ میری مانو تو تم یہ کام میرے ساتھ مل کر، کرلو۔ اس میں تمھارا بھی فائدہ ہے اور میرا بھی۔ تم ابھی اناڑی ہو، تمھارے لیے ہیروں کو چھپا کر رکھنا پھر انھیں فروخت کرنا مشکل ہوگا، جبکہ میں اس کام میں ماہر ہوں اور جب چوری کا پتا چلے گا تو سب سے زیادہ شک تم پر کیا جائے گا کیونکہ جس خفیہ جگہ پر ہیرے ہیں اس کے بارے میں صرف تمھیں پتا ہے اور شاید آج کل تمھارے مالی حالات بھی اچھے نہیں ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''
''نہیں شاید صحیح کہہ رہے ہو۔'' میں سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔
''ہوں، تو تم میرا ساتھ معاہدہ کرنے پر تیار ہو۔''
میں سوچ میں پڑ گیا، ایک طرف بدنامی اور جیل تھی اور دوسری طرف دولت۔
''دیکھو اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ میں تمھیں دھوکا دے دوں گا تو سن لو بے شک ہم غلط کام کرتے ہیں لیکن ہمارے دھندے میں زبان کا پاس رکھا جاتا ہے۔''
''ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔'' آخر میں نے ہامی بھر لی۔
''بہت خوب! تم نے عقل مندی کا ثبوت دیا، لاؤ اب وہ ہیرے مجھے دے دو۔''
''تو طے پایا، تین دن بعد میں تمھیں خود فون کروں گا، خبردار جو پولیس کو کچھ بتایا یا بتانے کی کوشش کی۔''
''فون کر کے میں تمھیں جگہ بتاؤں گا، تم وہاں آ کر اپنی

رقم لے جانا، آؤ چلیں۔"

"ایک منٹ امتیاز، تمھیں یہ کس طرح پتا چلا کہ خالہ کے پاس ہیرے ہیں اور ان کے کمرے میں ہی ہیں۔"

"بھئی خاندان میں یہ کس کو نہیں پتا کہ تمھاری خالہ کے پاس قیمتی ہیرے ہیں، مجھے بھی کسی سے پتا چلا تھا۔ رہی بات کہ مجھے کیسے پتا چلا کہ ہیرے اسی کمرے میں ہیں، تو یہ سیدھی سی بات ہے کہ ایسی قیمتی چیزیں ہر شخص اپنے کمرے میں ہی رکھتا ہے۔"

"اگر تم اس کمرے میں نہ آتے تو میں یہ خانہ خود ہی ڈھونڈ کر اس میں سے ہیرے نکال لیتا۔"

"امتیاز، کیا تمھیں یہ خیال نہیں آرہا کہ میں تمھیں پکڑوا دوں گا۔"

"آیا تھا، لیکن اب نہیں آرہا، کیونکہ اگر تم مجھے پکڑواؤ گے تو خود بھی پھنسو گے۔"

"وہ کیسے۔" میں گھبرا گیا۔

"وہ ایسے کہ میں نے تمھاری گفتگو ریکارڈ کرلی ہے۔"

"خیر، تم گھبراؤ نہیں، میں کچھ نہیں کروں گا۔"

میں نے خانہ کھولا اور ہیرے نکال کر اسے دے دیے۔

ہم دونوں باہر آگئے، لان میں ابھی تک ویسی ہی چہل پہل تھی، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی تھی کہ میں اور امتیاز اتنی دیر میں کیا کر کے آئے ہیں۔ میں ایک میز کی طرف بیٹھ گیا جس پر صرف ایک آدمی بیٹھا تھا۔

میں اس کے برابر رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیٹھنے کے بعد میں نے اس شخص کو مخاطب کیا۔ "سر کام ہو گیا ہے۔"

"بہت خوب!" اس نے جواب دیا۔

"ہیرے اس کی جیب میں ہیں۔"

"ٹھیک ہے، میں کانسٹیبل کو اشارہ کر رہا ہوں۔"

دراصل میرے ساتھ بیٹھا شخص پولیس انسپکٹر تھا۔

"ویسے بیگم صاحبہ کا آئیڈیا بہت اچھا تھا اور تم نے اس پر عمل بھی بہترین انداز میں کیا ہے کہ اسے شک بھی نہیں ہوا، دیکھو وہ کس قدر مطمئن ہے۔"

"ویسے انسپکٹر صاحب، میرا خیال ہے پرانا چور بھی یہی ہے۔"

"پرانا چور، کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے پہلے جو زیورات کی چوریاں ہوئی تھیں وہ بھی اسی نے کی ہوں گی۔"

اسی وقت انسپکٹر صاحب نے سپاہیوں کو اشارہ کیا اور انھوں نے امتیاز کو جا کر دبوچ لیا۔

میں اور انسپکٹر صاحب وہاں پہنچ گئے، خالہ بھی وہیں آگئیں جنھوں نے امتیاز کو پکڑنے کے لیے سارا پروگرام ترتیب دیا تھا۔ امتیاز کی جیب سے ہیرے بھی نکال لیے گئے۔ آخر کار پولیس امتیاز کو لے گئی۔ خالہ نے مجھے اتنی زبردست اداکاری اور ان کے اسکرپٹ پر پوری ترتیب سے عمل کرنے کے انعام میں ان ہیروں میں سے ایک ہیرا دے دیا۔ جو بہت قیمتی تھا۔

☆......☆

قرارداد پاکستان

کومل فاطمہ اللہ بخش

تحریک پاکستان ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قائم ہونے کے بعد عمل میں آئی ۔ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء لاہور کے منٹو پارک (موجودہ اقبال پارک) میں منعقد ہوا۔ اس میں جو قرارداد منظور ہوئی تھی اسے قرارداد پاکستان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مسلم لیگ کے اس اجلاس کے لیے اسٹیج حاجی الفردین نے تیار کیا۔ اسٹیج پر علامہ محمد اقبال کا یہ مشہور شعر لکھا ہوا تھا

جہاں میں اہل ایمان صورت خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

لاہور کے جلسے میں تقریباً ایک لاکھ شرکا کے سامنے شیر بنگال مولوی فضل الحق نے قرارداد پیش کی جس کی تائید چودھری خلیق الزماں نے کی تھی۔

قرارداد پاکستان انگریزی میں پیش کی گئی تھی، اجلاس میں شریک نوے فی صد لوگ انگریزی زبان نہیں جانتے تھے۔ اس لیے بعد میں اس کا ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے کیا۔ قائداعظم محمد علی جناح کی انگریزی تقریر کا ترجمہ بھی مولانا ظفر علی خان نے ہی کیا۔

اجلاس میں بشیر احمد کی نظم 'محمد علی جناح' انور غازی نے ترنم کے ساتھ پڑھی، ہم آج بھی پڑھتے ہیں۔

ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح
ملت ہے جسم جاں ہے محمد علی جناح

اس قرارداد میں لفظ پاکستان ایک بار بھی استعمال نہیں ہوا۔ 'پاکستان زندہ باد' کا نعرہ اجلاس میں سب سے پہلے مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن پنجاب کے صدر عبدالستار خاں نیازی نے لگایا۔ اس کے بعد حاضرین جلسہ نے بھی ان کا ساتھ دیا۔

۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو نماز جمعہ کے بعد اجلاس شروع ہوا تو قائد اعظم نے مختصر خطبہ دیا اگلے دن ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ (بمطابق ۳ صفر ۱۳۵۹ھ) کو مولوی ابوالقاسم فضل الحق نے یہ تاریخی قرارداد پیش کی۔ مولانا ظفر علی خان اور سر عبداللہ ہارون نے اس کی حمایت میں تقریریں کیں۔

اجلاس کے تیسرے اور آخری روز یعنی ۲۴ مارچ ۱۹۴۰ء کو صبح کے وقت نواب محمد اسمٰعیل خان، قاضی محمد عیسیٰ خان، عبدالمجید خان، اسماعیل ابراہیم چندی گر اور رات کے وقت سید ذاکر علی، بیگم محمد علی جوہر اور مولانا عبدالحامد بدایوانی نے قرارداد کی حمایت میں تقریریں کی آخر میں قائد اعظم محمد علی جناح نے قرارداد پر رائے پیش کی۔ تمام حاضرین نے قرارداد کی حمایت کرتے ہوئے اسے منظور کیا۔

اس اجلاس کی رپورٹنگ کے لیے ہندوستان بھر کے مقامی صحافیوں سمیت بی بی سی، واشنگٹن پوسٹ، لندن ٹائمز اور نیویارک ٹائمز کے علاوہ دیگر غیر ملکی اخبارات اور نیوز ایجنسیوں کے نمائندے موجود تھے۔

قرارداد پاکستان کی وضاحت کے لیے قائد اعظم نے برطانیہ کے مشہور رسالے ''ٹائم اینڈ ٹائیڈ'' میں مضمون لکھا۔ قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد قائد اعظم نے اپنے سیکریٹری مطلوب الحسن سید سے کہا کہ آج اگر علامہ اقبال زندہ ہوتے تو وہ خوش ہوتے کہ ہم سب نے مل کر ان کی خواہش پوری کردی۔

☆......☆

چین کی لوک کہانی

جی ہاں!

انتخاب: رومیسہ اسحاق

بہت دنوں کی بات ہے کسی جگہ ایک امیر زمیندار رہتا تھا جسے لوگوں نے قسائی کا نام دے رکھا تھا۔ وہ ایک بدشکل اور سفاک آدمی تھا اور خاص طور پر اپنے مزارعوں پر بہت ظلم ڈھاتا تھا۔

اس ظالم زمین دار کا ایک مزارعہ جس کا نام 'چاؤ' تھا کسی

دوسرے صوبے سے آیا تھا۔ چاؤ ایک محنتی شخص تھا اور اسے زمیندار کے پاس کام کرتے ہوئے سات سال ہو چکے تھے۔ زمیندار دن وہ سخت بیمار پڑ گیا۔ زمیندار نے دل میں سوچا کہ اب چاؤ کھیت میں کام کرنے کے لائق نہیں رہا خوامخواہ مفت کی روٹی توڑے گا اور میرے اوپر بوجھ بنا رہے گا۔ چنانچہ اس نے بڑی بے رحمی سے چاؤ کو گھر سے نکال دیا۔ چاؤ نے برسہا برس محنت کی تھی لیکن اب اسے کھانے کو سوکھی روٹی بھی میسر نہیں تھی۔ اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ وہ گرتا پڑتا واپس آیا۔ جب اس نے پڑوسیوں کو اپنی بپتا سنائی تو انھیں اس زیادتی پر بہت غصہ آیا اور انھوں نے ظالم زمین دار سے بدلہ لینے کی ٹھانی۔

ایک آدمی نے تجویز پیش کی۔ سب مل کر چندہ جمع کریں اس میں سے کچھ چاؤ کے علاج پر صرف کیا جائے اور باقی پیسوں سے ایک توتا خریدا جائے پھر توتے کو صرف ایک لفظ سکھایا جائے۔ اس نے اپنے منصوبے کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ اس طریقے سے سفاک زمیندار کو عبرتناک سزا دی جا سکتی ہے۔ سب کو تجویز پسند آئی۔

ایک سال گزر گیا۔ ایک دن چاؤ نے بہت نفیس کپڑے پہنے اور توتے کو لے کر زمیندار کے پاس گیا اس نے کہا ''بہت دن ہو گئے تھے، میں نے سوچا آج اپنے آقا کو سلام کر آؤں'' زمیندار نے جب یہ دیکھا کہ وہ خوش حال نظر آ رہا ہے تو اسے بہت حیرت ہوئی۔ اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''اتنے عرصے تک تم کہاں رہے ہو؟'' ایسا لگتا ہے جیسے......'' چاؤ نے اس کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا: ''شکر ہے کہ میں اب بہت اچھی حالت میں ہوں۔''

لیکن زمیندار کو تسلی نہ ہوئی وہ تفصیلات سننے کے لیے بے چین تھا۔ قدرے پس و پیش کے بعد چاؤ نے اپنی کہانی کا آغاز کیا۔

''گھر پہنچنے کے بعد میں رفتہ رفتہ صحت یاب ہونے لگا۔ ایک رات خواب میں ایک بزرگ میرے پاس آئے۔ انھوں نے بتایا فلاں جگہ تمھیں ایک عجیب و غریب توتا ملے گا جو ان تمام جگہوں کا علم رکھتا ہے جہاں سونے اور چاندی کے ذخائر دفن ہیں۔ چنانچہ میں اس جگہ گیا۔ اور منہ مانگی قیمت دے کر وہ توتا خرید لایا اس دن سے میرے اوپر دولت کی بارش ہونے لگی۔ یہ توتا میرے لیے بہت قیمتی ہے۔ اس لیے میں جہاں بھی جاتا ہوں۔ اسے اپنے ساتھ

رکھتا ہوں۔‘‘
زمین دار کو چاؤ کی باتوں کا یقین نہیں آیا چنانچہ اس نے کہا ’’میں اس پرندے کا امتحان لوں گا۔‘‘
چاؤ رضا مند ہو گیا۔ وہ زمین دار کو ساتھ لے کر ایک جگہ گیا جہاں ایک کنواں تھا۔
’’مٹھو میاں! مٹھو میاں کیا یہاں چاندی دفن ہے؟‘‘ چاؤ نے پوچھا۔ توتے نے فوراً جواب دیا ’’جی ہاں‘‘ چاؤ نے زمین کھودی تو وہاں سے چاندی سے بھرا ہوا ایک برتن برآمد ہوا اور دونوں آگے بڑھے اور ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں زمین میں ایک چھوٹا سا سوراخ نظر آ رہا تھا۔ چاؤ نے پوچھا: ’’مٹھو میاں مٹھو میاں کیا اس جگہ سونا دفن ہے؟‘‘
’’جی ہاں‘‘ توتے نے حسب عادت جواب دیا۔ چنانچہ چاؤ نے زمین کھودی تو سونے سے بھرا ہوا ایک چھوٹا برتن برآمد ہوا۔ زمیندار کا منھ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔
وہ توتے کی قدر و قیمت کا قائل ہو گیا۔ اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ توتا کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے دن اس نے ایک پرتکلف دعوت کا اہتمام کیا اور اس میں شہر کے معززین لوگوں کو مدعو کیا۔ اس کا خیال تھا کہ ان لوگوں کی موجودگی میں چاؤ شرما حضوری کے باعث توتا بیچنے سے انکار نہ کر سکے گا۔ معززین شہر اس عجیب و غریب توتے کو ایک نظر دیکھنے کے لیے بے چین تھے۔ اس لیے بے تابانہ اس کو دیکھنے کے لیے حویلی میں آ موجود ہوئے۔ ہر طرف ’مبارک ہو‘ مبارک ہو‘ کا شور تھا۔
آخر کار زمیندار اپنے مقصد کی طرف آیا اور چاؤ سے یوں گویا ہوا۔ ’’تم توتا میرے ہاتھ فروخت کر دو میں تمھیں منھ مانگی قیمت دوں گا۔‘‘
چاؤ نے قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا: ’’آپ تقریباً سات سال تک میرے آقا رہ چکے ہیں۔ میں ان لوگوں کے سامنے کس طرح انکار کر سکتا ہوں لیکن یہ پرندہ بہت قیمتی ہے۔ میں مہمانوں سے کہتا ہوں کہ وہ خود اس کی قیمت تجویز کریں۔
’’گھبراؤ نہیں۔‘‘ مہمانوں نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا: ’’ہم اس کا خیال رکھیں گے کہ تمھارے ساتھ انصاف ہو۔‘‘
زمین دار خوشی سے پھولا نہیں سمایا تھا۔ اتنے میں اس کی بیوی نے اس کے کان میں کہا: ’’اتنی نایاب چیز کے لیے تو ہم اپنی ساری جمع پونجی دے سکتے ہیں۔‘‘ بیوی کی تجویز اسے مناسب معلوم ہوئی اور اس نے اسی پر عمل کیا۔
تمام لوگوں کے سامنے گواہوں کے دستخط کے ساتھ خریداری کی رسید تیار کر لی گی۔ طے یہ پایا کہ زمیندار کی تمام جائیداد توتے کے عوض چاؤ کی ہو جائے گی۔ آخر میں ایک بار پھر تمام مہمانوں نے اسے مبارکباد دی۔
ظالم زمین دار توتا حاصل کر کے بے انتہا خوش تھا۔ اس نے بڑی بے تابی کے ساتھ توتے کو اٹھایا اور جلدی جلدی ڈگ بھرتے ہوئے باہر نکل گیا۔ دوستوں اور رشتہ داروں کے علاوہ اس کے گرگے بھی اس کے پیچھے چل پڑے۔ جنھیں اس نے خاص طور پر سونے اور چاندی بٹورنے کا تماشا دکھانے کے لیے بلایا تھا۔
جب وہ ایک تالاب کے کنارے پہنچے تو زمین دار نے بے خبری سے کہا: ’مٹھو میاں! مٹھو میاں! کیا اس جگہ چاندی

دفن ہے؟‘‘

’’جی ہاں‘‘ توتے نے جواب دیا۔ ان لوگوں نے زمین کھودی لیکن وہاں کچھ نہ ملا۔ اب سب لوگ آگے کی طرف چل پڑے۔ ایک پہاڑ کے قریب پہنچ کر زمیندار نے پوچھا۔’’مٹھو میاں! مٹھو میاں کیا اس جگہ سونا دفن ہے؟‘‘

’’جی ہاں‘‘ توتے نے جواب دیا۔ اس کے گرگوں نے زمین کھودی لیکن وہاں سے بھی کچھ نہ ملا۔ یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں تھی کیونکہ چاؤ کی طرح وہاں کسی نے خزانہ پہلے سے دفن نہیں کر رکھا تھا۔ اب زمیندار نے محسوس کرلیا۔ کہ اسے دھوکا دیا گیا ہے؟ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا:’’مٹھو میاں کیا تم نے مجھے دھوکا دیا ہے؟‘‘

’’جی ہاں‘‘ توتے نے جھٹ جواب دیا۔

’’مٹھو میاں کیا تم نے مجھے بیوقوف بنایا ہے؟‘‘

’’جی ہاں۔‘‘ زمیندار کا چہرہ سرخ ہوگیا اور اس کی آنکھیں باہر کو نکل آئیں۔ اس نے چیختے چلاتے ہوئے توتے کو زمین پر پھینک دیا۔ بد بخت توتے تو میری موت کا پیغام بن گیا ہے۔‘‘

توتا اپنے پر پھڑ پھڑاتے ہوئے آناً فاناً ایک قریبی درخت پر جا بیٹھا اور زور سے چلایا’’جی ہاں۔‘‘

☆......☆

شہہ زور

حرا زرین

یہ اس زمانے کا قصہ ہے جب ایپل (apple) اور بلیک بیری صرف پھل ہوتے تھے۔ ہمارے ہاتھ اردو کی وہ کتاب لگ چکی تھی جس میں شامل مضمون بائیسائیکل کی تعلیم نے ہمارے حواسِ خمسہ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور ہمارے ذہن کے کسی روشن گوشے میں یہ بات بٹھا دی تھی کی اب ابا کی گود سے اُتر کر دو پہیوں پر سوار ہونے کا وقت آن پہنچا ہے۔ ڈبل فیگر میں داخل ہونے کے بعد یہ احساس مزید شدت سے جاں گزیں ہوگیا اور ہم نے فیصلہ کرلیا کہ کفایت شعاری اختیار کرتے ہوئے تین پہیوں کے بجائے دو پہیوں والی سائیکل کا حصول جلد از جلد ممکن بنایا جائے گا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے دونوں چھوٹے بھائیوں کو ساتھ ملایا اور مطالبہ والدین کی کمیٹی میں منظوری کے لیے رکھ دیا۔ چند ہی دنوں میں دو سائیکلیں آموجود ہوئیں لیکن برا ہوا ہمارے ساتھ کہ ایک سائیکل ہمارے لحاظ سے بڑی اور دوسری چھوٹی تھی۔ چھوٹی چلاتے تو شرم آتی تھی لہٰذا بڑی کو ہی مشقِ ستم بنایا اور’’یہ بازی عشق کی بازی ہے جی جان لگا دو ڈر کیسا‘‘ کا ورد کرتے ہوئے سوار ہوئے۔ پہلے پہل تو ابا جی نے ہینڈل پکڑ کر چلانا سکھایا، پھر ہم نے خود لڑکھڑاتے ہوئے بسم اللہ کی اور ہفتے بھر میں ہی فراٹے بھرنے لگے لیکن فراٹے بھرنے تک کے اس سفر میں ہم اپنا اور سائیکل کا کافی نقصان کر چکے تھے مگر اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں یہ سوچ کر سردیوں کی شاموں میں سائیکل چلانے کا شغل برقرار رکھا۔

سرِ شام ہی محلے کے بچوں کا سائیکل بردار قافلہ کارساز کی گلیوں میں گشت شروع کرتا۔ یہ تو بھلا ہو فوجیوں کا کہ

انھوں نے اتنی کھلی سڑکیں بنائی ہیں کہ گرنے کا نقصان کم ہوتا تھا ورنہ جس حساب سے ہماری سائیکل ہر سپیڈ بریکر پر سڑک سے اتر کر مٹی میں لہراتی ہوئی شانِ بے نیازی دکھاتی تھی اگر اس مٹی کی جگہ گھر ہوتے تو......بس آگے سوچنا فضول ہے کیونکہ وہاں گھر ہیں ہی نہیں بھلا پھر کیوں سوچ سوچ کر اپنا خون خشک کریں۔ پہلے ہی ٹیکے لگے پھل، اینٹیں پسی مرچیں، پاؤڈر ملا دودھ، فارمی مرغیاں استعمال کرکر کے خون کی کمی ہے۔اس سے پہلے کہ ہم ملاوٹ سے حکومت اور حکومت سے گزر کر امریکا کے سر الزام دھریں واپس دو پہیوں پہ سوار ہونا بہتر ہے۔

گرنے، اٹھنے اور اٹھ کر گرنے کی اس مشق کے بعد ہم اس قابل ہو چکے تھے کہ روانی سے سڑک پر سائیکل چلا سکیں مگر شوکت تھانوی صاحب کی طرح ہمارے لیے بھی سفر کے اختتام پر گرنا لازمی ہو چکا تھا کیونکہ سائیکل کی بریک ہمارے جوش کے سامنے ہوش کھو بیٹھتی تھی۔ پاؤں تو زمین پر لگتے نہ تھے لہٰذا سائیکل روکنے کے لیے سڑک خالی ہونے کا انتظار کرتے اور جیسے ہی موقع ملتا گھر کے سامنے کھڑی ہائی روف یا عقب میں نصب کھمبے سے آنکھیں بند کر کے سائیکل ٹکرا دیتے ، مثلِ برق زمیں پر گرتے اور فوراً اٹھ کھڑے ہوتے لیکن یقین جانیے اس گرنے کی کچھ تکلیف محسوس نہ ہوتی تھی آخر ہم شہ زور تھے گرنا تو لازمی تھا۔ گھٹنوں کے بل چلنے والے طفل ناداں تو نہ تھے۔ویسے مرزا عظیم بیگ کے اس شعر کو اتنا غلط رائج کیا گیا ہے کہ درست شعر پڑھنے پر سامنے والا ایسی کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہے کہ ایک لحظہ کو بندہ گڑبڑا کر رہ جائے درست شعر

کچھ یوں ہے۔

شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثلِ برق
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

نہ جانے ”گرتے ہیں شہ سوار ہی میدان جنگ میں“ کس کا ایجاد کردہ مصرع ہے خیر اسی طرح چھپ چھپ کر گرنے کا سلسلہ جاری تھا کہ ایک دن ہماری شامت آئی اور بھائی کو شرارت سوجھی۔اس نے ہماری فراٹے بھرتی سائیکل میں اپنی سائیکل لا ماری بس پھر کیا تھا بیچ سڑک سائیکلیں الجھیں، ہمارے ذہن میں گردش کرتے تارے اُلجھے اور پھر ہم آستینیں چڑھا کر بھائی سے اُلجھے۔ کچھ عرصہ یہ شغل جاری رہا پھر ہم نامور صحافی بننے کا خواب آنکھوں میں لیے کتابوں میں غرق ہو گئے۔

ہمیں سائیکل چھوڑے تقریباً سات سال بیت چکے تھے کہ گزشتہ سال پنجاب میں کزن کی سائیکل ہمارے ہاتھ آ گئی۔ ہمارے اندر کا سائیکل سوار انگڑائی لے کر بیدار ہوا اور ہم عین عید کے روز اپنا بھاری بھر کم فراک سنبھالے

سائیکل پر سوار ہو گئے مگر ہم سائیکل چلانا ایسے بھول چکے تھے جیسے کوا ہنس کی چال چلنے کے بعد اپنی چال!!! ہم ہینڈل سنبھالے پیڈل مارنے کی ناکام کوشش میں سائیکل کو پورے صحن میں گھسیٹ رہے تھے کہ اچانک نظر اُٹھی اور دوسری منزل پر کھڑے ماموں جان ہمارے بچپنے پر مسکراتے نظر آئے۔ اُف! جی چاہا زمین پھٹے اور ہم سائیکل سمیت اس میں سما جائیں۔ سائیکل وہیں چھوڑی اور شرم کے مارے ستون کی آڑ میں چھپ گئے۔ وہ دن اور آج کا دن ہم سائیکل سے چھپتے ہیں اور سائیکل ہم سے چھپتی ہے۔

☆......☆

سیب نے دکھایا کمال

محمد طلحہ نذیر

''اس بچے کی زندگی شاید کچھ لمحے کی ہی ہوگی۔'' ڈاکٹر تو یہ خبر دے کر چلا گیا مگر بچے کی پیدائش پر خوش والدہ کے چہرے پر اچانک زردی چھا گئی تاہم ڈاکٹرز اس بچے کی زندگی کو بچانے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹرز نے خوش خبری سنائی کہ بچہ بچ گیا ہے مگر انتہائی کمزور ہے۔ بچے کا بچپن جیسے تیسے گزرنے لگا۔ اکثر بیماری آلیتی۔ بیماری، کمزوری اور والدین کی غربت کی وجہ سے بچہ اسکول نہیں جا سکا۔ والد صاحب تو بے چارے پیدائش سے چار ماہ قبل ہی انتقال کر چکے تھے، جب کہ والدہ نے کسی اور سے شادی کر لی تھی۔ بہن بہت ہی پیار سے رکھتی تھی۔ آخر زندگی کی گاڑی تو چلانی تھی... بکریوں کا ریوڑ چرانے لگا۔ روز بکریاں چرانے لے جاتا اور واپسی پر مالک کے گھر کے خوب صورت باغ میں بیٹھ کر درخت سے ٹیک لگائے ستانے لگتا۔ ایک دن ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور ماحول خوش گوار تھا۔ وہ معمول کے مطابق ستا رہا تھا کہ اچانک درخت پر سے اس کے سر پر سیب آ گرا۔ اس نے پہلے اوپر کی جانب دیکھا اور ننھے سے دماغ میں یہ خیال کوندا کہ یہ سیب شاخ سے جب الگ ہوا تو نیچے ہی کیوں گرا! اوپر کی طرف کیوں نہ چلا گیا۔ والدہ کے پاس آیا اور اپنا سوال پوچھا۔ اماں ہنسنے لگی اور کہا: ''پگلے! چپ چاپ سیب دھو کر کھالے۔ سیب کیسے گرا! یہ تو باغ کے مالی کو سوچنا چاہیے۔'' مگر دماغ پر ٹھنڈ نہ پڑی اور پھر سے اس درخت کے پاس پہنچا اور درخت پر سیب کو رکھا مگر وہ نیچے پھر گر گیا۔ پھر ہاتھ میں پکڑ کر چھوڑا۔ نتیجہ پھر وہی کہ نیچے گر پڑا۔ اب کی بار ہوا میں اچھال دیا کہ شاید اب نیچے نہ آئے...... مگر وہ فضا میں ایک سیکنڈ کے ہزارویں لمحے میں رک کر پھر سے نیچے کی طرف ہی آ گیا۔ اب اس کے ذہن نے گھنٹی بجائی کہ ضرور زمین میں ایسی طاقت ہے کہ جو ہر
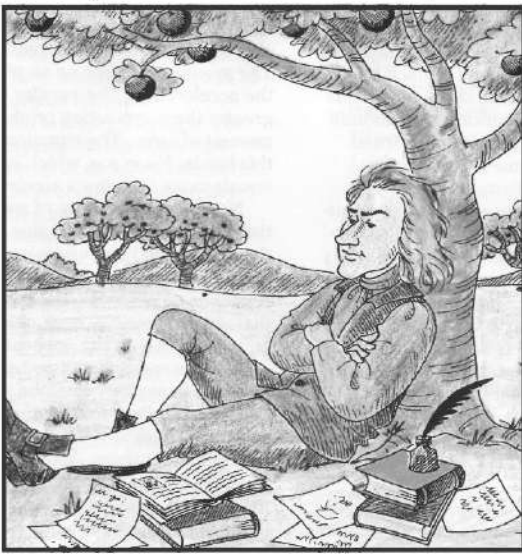
چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یوں اس نوعمر بچے نے ''نظریہ کشش ثقل'' پیش کیا۔ پڑھائی میں بہت دل چسپی تھی اور اپنی سب سے زیادہ پیار کرنے والی ہمشیرہ کی کتابیں بچپن سے ہی پڑھتا تھا۔ آخر بہن نے والدین سے ضد کر کے اسکول میں داخل کروادیا۔ اسکول کا زمانہ بھی بڑا عجیب تھا۔ ہر وقت مذاق کا نشانہ بنا رہتا۔ سب سے کمزور بھی تھا اس لیے بچے اپنا غصہ بھی اُس پر اتارتے۔ ایک مرتبہ استاد نے جماعت کی پہلی پوزیشن لینے والے بچے کو کسی بات پر لتاڑ دیا۔ اس بچے نے اپنا سارا غصہ اس پر اتار دیا اور اسے خوب پیٹا۔ آخر انتقام لینے کی ٹھانی اور اس پہلی پوزیشن لینے والے طالب علم کو تعلیمی میدان میں پیچھے چھوڑ دیا یعنی محنت کر کے امتحانات میں پہلی پوزیشن لے لی۔ یوں پڑھتے پڑھتے تعلیمی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کالج میں پہنچ گیا۔ کالج کے لڑکے بھی آگے نہ بیٹھنے دیتے اور ہر وقت تنگ کرتے رہتے۔ ایک دن کالج کے ایک اعلیٰ تجربے کار پروفیسر لیکچر دے رہے تھے کہ ایک طالب علم نے سوال اٹھایا۔ پروفیسر صاحب نے اس کو حل کرنا شروع کیا اور کرتے کرتے ایک جگہ رک گئے۔ ذہن میں کچھ نہ آیا کہ اب کیسے حل ہوگا۔ پوری کلاس قہقہے مارنے لگی مگر کلاس میں ایک منمناتی سی آواز گونجی جو اس سوال کو مزید آگے بڑھانے کا حل پیش کر رہی تھی۔ پروفیسر کی تو پہلی ہی بے حد سبکی ہوئی تھی۔ دھیان نہ دیا کہ آواز کدھر سے آئی اور حل کرنا شروع کیا اور آخر کار جواب آ گیا۔ پروفیسر صاحب جواب حل کر کے کچھ قدم آگے چل کر بورڈ کی جانب دیکھنے لگے اور سوچا کہ ایسا جواب تو میں نے کبھی حل ہی نہیں کیا۔ پھر سوال کیا کہ کس نے یہ حل کروایا۔ سب کی نظریں لمبے بالوں والے کمزور سے جسم کے طالب علم کے چہرے پر مرکوز ہوگئیں۔

''نوجوان! تم نے یہ کیسے حل کیا۔'' پروفیسر صاحب نے حیرانی سے سوال پوچھا۔ ''ایسے سوال تو میں نے اپنے بچپن میں حل کر لیے تھے۔'' یہ سن کر پروفیسر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ آخر اس نے اپنی بچپن کی کاپی دکھائی جس میں ایسے ایسے نظریے تھے کہ واقعی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں۔ پروفیسر صاحب نے خوب تعریف کی اور ان تمام مضامین کو جوڑ کر کتابی شکل میں شائع کرنے کا سوچا۔ ابھی پہلا ایڈیشن چھپ کر ہی آیا تھا کہ ان کا لقب ''سر'' پڑ گیا اور وہ کمزور سا بچہ ایک نامور سائنس دان بنا۔ ان کا نام ہے ''سر جیمز آئزک نیوٹن'' جن کے کئی نظریے ہیں کشش پر، حرکت پر کہ جنھوں نے اس کائنات کی تشریح کرنے میں ایک کردار ادا کیا۔ انھوں نے کئی نظریے پیش کیے جو آج بھی کتابوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔

☆......☆

خوب صورت خول

عفیفہ علی

ایک دفعہ کا ذکر ہے، ایک جنگل کے تالاب میں ایک کچھوا رہتا تھا جس کا نام نومی تھا۔ نومی کی خاص بات جو اُسے دوسرے کچھوؤں سے منفرد بناتی تھی وہ تھا اس کا خوبصورت خول۔ اس کا خول حیران کن طور پر مختلف رنگوں سے مزین تھا۔ دور سے دیکھتے پر یوں لگتا جیسے نومی نے رنگ برنگے
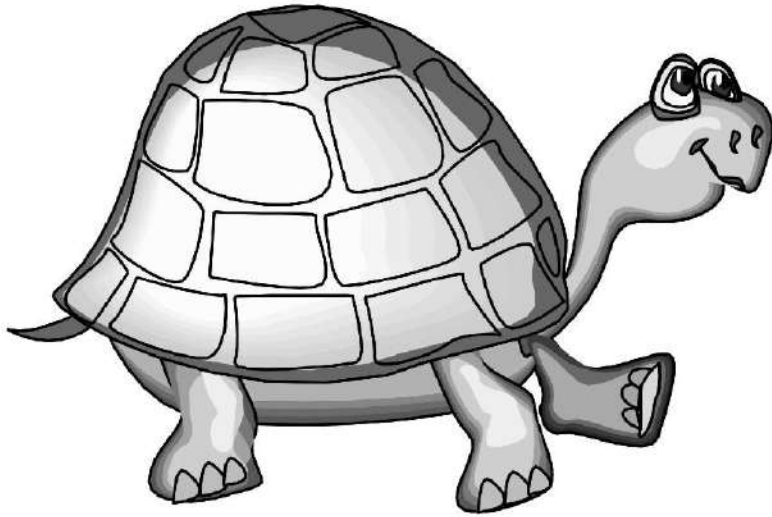
پھولوں کی چادر اوڑھ رکھی ہے۔ اپنے اس خول کی وجہ سے وہ بہت خوب صورت نظر آتا تھا مگر اس کی ایک بُری عادت بھی تھی کہ اسے اپنی خوبصورتی پر غرور تھا۔ آپ سب جانتے ہیں کہ سب کی شکل وصورت اللہ نے بنائی ہے اور اس پر ہمارا اپنا کوئی اختیار نہیں اگر کوئی چیز اپنے بس سے باہر ہو تو اس پر دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی اِترانا چاہیے۔

ایک روز نومی معمول کے مطابق جنگل کی سیر کو نکلا۔ وہاں پر اس کی ملاقات ایک دوسرے کچھوے سے ہوئی۔ کچھوے نے اپنا نام سونو بتایا۔ وہ آپس میں گپ شپ کرنے لگے۔ نومی نے عادت کے مطابق اپنی خوبصورتی کی تعریفیں کرنا شروع کردیں اور سونی کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔ ''تم تو بہت ہی عام شکل کے مالک ہو۔ تمھیں دیکھنا کوئی پسند ہی نہیں کرتا ہوگا۔''

یہ سن کر سونو رونے لگا۔ سونو کو روتا دیکھ کر نومی زور زور سے ہنسنے لگا۔ اچانک ایک روشنی کا جھماکا ہوا اور ایک پری نمودار ہوگئی۔ پری نے نومی سے کہا: ''اپنی خوبصورتی کی تعریف کرنا اور دوسروں کا دل دُکھانا بہت بُری بات ہے اگر تم نے یہ عادت ترک نہ کی تو میں تمھارا خوبصورت خول غائب کردوں گی اور اس کی جگہ ایک عام سا خول آجائے گا اور تم بھی عام سے کچھوے کی طرح ہو جاؤ گے اور یاد رکھنا کبھی دل میں بھی ایسی بات نہ سوچنا۔'' یہ کہہ کر پری غائب ہوگئی۔

نومی نے دل میں سوچا کیا فضول بات تھی۔ پری بھی یقیناً میری خوبصورتی سے جل گئی ہوگی۔ اس نے مجھ جیسا حسین کچھوا کہاں دیکھا ہوگا۔ اس خیال کا دل میں آنا ہی تھا کہ اچانک اس کا خول غائب ہوگیا۔ نومی ہکا بکا رہ گیا۔

سونو سمیت تمام کچھوے وہاں جمع ہو گئے اور نومی پر ہنسنے لگے کیونکہ وہ بھی اب ان کے جیسا ہو گیا تھا۔ نومی کو پہلے تو کچھ سمجھ نہیں آیا لیکن جب سمجھ آیا تو بڑی دیر ہو چکی تھی۔ اس کی امی نے اس کا حوصلہ بڑھایا کہ خول خوب صورت ہونے سے کچھ نہیں ہوتا، خوب صورتی تو خول میں چھپے جسم کے اندر دل میں ہوتی ہے، اگر دل میں غرور نہ ہو دوسروں کے لیے محبت ہو تو یہ خوب صورتی اصل خوب صورتی ہوگی۔ نومی کو امی کی بات سمجھ آچکی تھی۔

پھر پورے جنگل نے دیکھا کہ ایک عام سے خول والے کچھوے نے اپنے اچھے رویے کی وجہ سے سب کے دل جیت لیے۔

☆......☆

خط.....رے

اپنے طویل لیکن دلچسپ خط میں بنت مختار احمد صدیقی فرماتی ہیں

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

اپنے ننھے منے پیارے سے خط کے ساتھ حاضر ہیں، امید کرتے ہیں کہ ساتھی بالکل خیریت سے ہوگا اور ساتھی کے ساتھی بھی بالکل ٹھیک ٹھاک مونگ پھلیاں چھیلتے چلغوزے کھاتے ڈاک کے ڈھیروں میں گم سم بیٹھے ہوں گے تاریخ کی کھوج ہم اپنا جواب یہیں بتائے دیتے ہیں اس سرزمین کا نام فلسطین ہے۔ یہاں سے یہودی ہی بار بار بے دخل کیے گئے ہیں اور ابھی بھی پنجے گاڑے بیٹھے ہیں۔ مسلمانوں کی اس سرزمین سے جذباتی وابستگی کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ انبیا کی سرزمین ہے دوسری وجہ مسلمانوں کا قبلہ اول بیت المقدس یہیں ہے۔ عیسائیوں نے یہاں صلیبی جنگیں لڑی ہیں جس میں انہیں بدترین شکست اُٹھانی پڑی کیونکہ اس وقت تمام مسلمان ہوش و حواس کے ساتھ جہاد جیسی عظیم عبادت سے جڑے ہوئے تھے۔ دونوں عظیم راہ نماؤں کے نام اتفاقاً ہمیں بالکل معلوم نہ ہوسکے۔ ''السلام علیکم'' فصیح بھائی ننھے بچے ہیں کہ ابھی تک بغیر سطری کاغذ کے لکھ نہیں سکتے۔ یہ ہمارا تبصرہ ہرگز نہیں بلکہ اندر کی ننھی بچی کا تبصرہ ہے جو آپ کو دِکھ نہیں سکتی تھی۔ ہورہے گا کچھ نہ کچھ...... ضرور سیما آپی کچھ نہ کچھ تو ہوگا ہی ہوگا یہ جنتری بنانے والے ہمیں کتنا بے وقوف بناتے ہیں۔ نیلم پری کی کہانی۔ راحت عائشہ صاحبہ یہ کیا پرنسپل نے ننھی پری کے ساتھ بہت زیادہ برا کیا ہے کتنا معصوم سا دِکھتا ہے شکل سے اور کام توبہ توبہ اگر نیلم کو نمونیہ ہوجاتا تو ہم ضرور پرنسپل پر دعویٰ دائر کرتے۔ سیرت لائبریری

کے بارے میں پڑھ کر لائبریری دیکھنے کا شوق پیدا ہوگیا۔ اپنے علاقے میں لائبریری قائم کرنا میرا شوق ہے۔ اپنے علاقے میں ہم نے تو بس ایک چھوٹی سی لائبریری دیکھی ہے اس کے علاوہ علاقے میں کہیں لائبریری کا سنا نہ دیکھا، اس میں کچھ کتابوں کے نام ہیں جیسے مجمع الزوائد ، بدائع الصنائع، اشراف الہدایہ جبکہ ہم نے بالترتیب یہ نام اکثر حوالوں میں دیکھا ہے مجمع الزوائد، بدائع الصنائع، اشرف الہدایہ، عین ممکن ہے کہ یہ سب الگ الگ کتابیں ہوں لیکن نام ملتے جلتے ہیں۔ ''ٹوتھ پیسٹ کا معما'' واہ جی واہ واقعی گھر میں چھوٹا ہونا بہت مشکل ہے اول تو بالکل ٹھیک ٹھیک کام کرو لیکن اُلٹا اسی کو بُرا کہا جائے گا۔ اس لیے ہمارا معروف ومقبول عام قول ہے کہ 'گھر میں سب کو بڑا ہونا چاہیے۔' تنقیدی تبصرہ میں جس طرح انکل ہاشمی سب کی غلطیاں چنکے چنکے پکڑتے ہیں تو شاید بطور بدلے کے کمپوزر صاحب نے کچھ غلطیاں اس مضمون میں بھی ہاشمی انکل کے کھاتے میں ڈالنے کی ناکام کوشش کی ہے اور پروف ریڈر نے بھی 'دانستہ' اس غلطی سے صرف نظر کیا ہے۔ جملہ ہے اوڑھادی بغیر واڈ کے ارے بابا یہ بغیر واڈ کیا بلا ہے پہلے ہم نے اسے راڈ پڑھا لیکن اوڑھادی میں راڈ کہاں سے آ گیا پھر غور کرنے پر پتا چلا کہ یہ 'واڈ' لکھا تھا جو کسی مہربان کی مہربانی کی نظر ہوگیا۔ تخم بالنگا اہل پنجاب کے یہاں تو تخ ملنگا کہلاتا ہے اور شاید ہماری طرف اسی کی بگڑی شکل توت ملنگا کہلاتی ہے ایک حکیمی دوا کی پرچی میں پہلی مرتبہ تخم بالنگا پڑھا تو بڑی حیرانی سے پوچھا یہ کیا چیز ہے وہ تو ابو جی کو فارسی سے ذرا سی شد بد ہے تو ہمیں بتایا یہ وہی ہے جو ہماری طرف توت ملنگا کہلاتا ہے۔ ساتھی رائٹرز ایوارڈ اور مشاعرہ کی روداد بہت عمدہ رہی۔ شاعر سب شرمائے تھے۔ بہت عمدہ واقعی باتونی لوگ ہر جگہ چھا جاتے ہیں گھس بیٹھیے جسے کہتے ہیں لیکن نہ بھئی مشاعرے میں کسی گھس بیٹھیے کا کیا کام لیکن شاعروں کے شرمانے کی وجہ سمجھ نہیں آیا، کیا آپ لوگوں نے شاعروں کو لال رومال پکڑا دیا تھا کہ وہ منہ چھپا کر شرماتے رہیں؟ ہمارا کیا قصور واہ جی وا...... دیکھیں بھئی ہم یہ تو نہیں کہتے کہ ہماری تحریر ضرور چھپنی چاہیے بلکہ ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ اگر ہماری تحریر آپ تک پہنچ جائے تو ہمیں پتا تو چل جائے ورنہ اگر آپ ہمیں نہ بتائیں گے تو ہمیں کیسے پتا چلے گا کہ ہماری تحریر پہنچی کہ نہیں پہنچی، اب ہم نے اپنی تحریر مینڈک اور اسکوٹی کے متعلق مجلس ادارت والوں سے معلوم کرنا چاہا، فرماتے ہیں کہ کوشش جاری رکھیں میں دیکھ لیجیے گا اب ہم چار مہینوں سے اس پر شکاری تیندوے کی طرح نظر جمائے بیٹھے ہیں لیکن مینڈک اور اسکوٹی کے نام کی کسی کہانی کا کوئی اتا پتا ہی نہیں۔ آپ کی نگارشات کا سلسلہ بہت اچھا ہے، نئے بچوں کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ شرارتی بھوت بہت عمدہ تحریر تھی۔ ستارے والی لڑکی بہت ہی عمدہ سبق دے گئی۔ آپ کی تخلیق میں سارے ہی اچھے تھے رنگ بھرنگی میں رنگ برنگی ہوتا تو زبان کو دو چشمی ھا کا ثقل برداشت نہ کرنا پڑتا۔

......کوشش جاری رکھیں میں نام نہیں آیا تو اس کا مطلب تحریر قابل اشاعت ہے، لیکن لائن میں لگی ہوئی ہے۔

شاہدہ پروین لمبی مصروفیات کے بعد تشریف لائی ہیں......

لمبی مصروفیات کے بعد فراغت کی کچھ ساعتیں نصیب ہوئیں تو ہم نے سوچا کہ کیوں نہ اس بار خط لکھ ہی ڈالیں۔ دراصل فراغت کے علاوہ سالنامہ نہ ملنے کا دُکھ بھی ہمیں اب احتجاجی خط لکھنے پر مجبور کر چکا ہے اور ہم رقم طراز ہیں۔ آپ کو ہمیں جگہ دینی پڑے گی ورنہ...... خیر ورنہ کو چھوڑیے ہم تو ابھی تک اس دُکھ سے باہر نہیں نکلے کہ ساتھی رائٹرز ایوارڈ اور مشاعرے میں شرکت نہ کر سکے۔ سرورق دل دکھانے، جلانے، للچانے والا تھا۔ زخم پہ نمک پاشی کرنے والا تھا، آگے بڑھے۔ 'دل پہ دستک' سے فیضیاب ہوئے۔ 'ہو رہے گا کچھ نہ کچھ' بہت اچھی لگی۔ مگر ذرا سا...... ذرا سا اگر مطلب تھوڑا اور حصہ کہانیوں کا ذرا بڑے بچوں کے لیے بھی مختص کیا جائے تو کیا بات ہوگی۔ اس بار کا رسالہ ہماری چھوٹی بہن کو زیادہ پسند آیا۔ 'آپ کی تخلیق' کا بھی خاص طور پر ذکر کرنا چاہوں گی اور آخر میں خطرے کی کیا بات ہے۔ تبصرے اور تجزیے پڑھ کر سالنامہ سے رتی برابر لطف اندوز ہوئے اور رائٹرز ایوارڈ دیکھ دیکھ کر اور پڑھ پڑھ کر لطف اندوز ہوئے خیالوں ہی خیالوں میں اور ہاں ہمیں بھی ایک ایوارڈ چاہیے۔ ایوارڈ کا اعلان

کر کے بھجوا دیجیے گا۔

🙞......ایوارڈ لینے کے لیے مزیدار کہانیاں لکھ کر بھیج دیجیے۔

ساتھی کی مستقل قاریہ عائشہ ناصر نے لکھا ہے

سال نو کا پہلا شمارہ خوبصورتی سے سجے سرورق کے ساتھ نگاہوں کو بھا رہا تھا۔ سرورق کے بعد السلام علیکم پر نگاہ دوڑائی تو ہمیشہ کی طرح ایک عدد نصیحت کو منتظر پایا۔ کہانیوں میں سب سے اچھی 'ہو رہے گا کچھ نہ کچھ' تھی۔ یہ کہانی ان لوگوں کے لیے قابل غور تھی جو یہ ہفتہ کیسا رہے گا اور اس جیسے دوسرے کالم پر آنکھیں بند کر کے یقین کرتے ہیں۔ 'نیلم پری کی کہانی'، بالکل چھوٹے، توتلی زبان میں بولتے بچوں کی کہانی تھی۔ ہم چونکہ اتنے چھوٹے نہیں ہیں اسی لیے ہمیں خاص متاثر نہ کر سکی۔ 'سیرت لائبریری' پڑھ کر اندازہ ہوا کہ عام شہروں میں بھی خاص جگہیں موجود ہیں۔ 'ٹوتھ پیسٹ کا معما'، عجیب وغریب کہانی تھی۔ بھلا ٹوتھ پیسٹ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے۔ 'بچوں کا کل پاکستان مشاعرہ' اور 'ساتھی رائٹرز ایوارڈ' کی روداد دلچسپ تھی۔ 'ایک انچ کی کلی' سبق آموز تحریر تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے قد وقامت سے نہیں سوچ سے بڑا بنتا ہے وگرنہ بلند قامت لوگ کبھی نیچ اور پست قامت لوگ کبھی بڑے کام نہیں کرتے۔ یوسف بن تاشفین کے بارے میں مختصراً معلومات اسلام کے شاندار ماضی کی یاد دلا رہی تھی۔ 'پانی کے سالمے کا سفر نامہ' اب خالصتاً بایولوجیکل تحریر بن گیا ہے۔ اسے سمجھنا اب عام انسان کے بس کی بات نہیں رہی۔ 'شرارتی بھوت' پڑھ کر ہمیں شرارتی بھوت کے گھر والوں پر حیرت ہوئی۔ بڑے بیوقوف تھے جو ٹافی بسکٹ اور چاکلیٹ کی چوری کو جن سے جوڑ بیٹھے۔ 'ستارے والی لڑکی' چمکنے دمکنے کا راز بتا کر یہ ثابت کر دیا کہ انسان کی پہچان اس کی شکل نہیں بلکہ کردار بنتا ہے۔ آپ کی تخلیق میں ماریہ فاروق اور زاہدہ عروج تاج نے اچھا پیغام دیا۔

آمنہ خاندان بھی ہمارے درمیان رونق افروز ہے

نئے سال کا پہلا شمارہ اچھا لگا۔ مشاعرہ زبردست تھا۔ 'ٹوتھ پیسٹ کا معما' پڑھ کر ہمیں تو اُلٹی آنے لگی۔ سیرت لائبریری اچھی لگی۔ یوسف بن تاشفین کے بارے میں معلومات زبردست تھی۔ 'اردو زباں ہماری' ہمیں اچھا لگتا ہے اور 'حمد رب جلیل'، 'وہ فاتح عالم' تھا'، 'مچھر نے کاٹ کھایا' نظمیں اچھی تھیں۔ 'شرارت بھوت' اچھی لگی۔ 'ہو رہے گا کچھ نہ کچھ' پڑھ کر مزہ نہ آیا کیونکہ یہ تو ہے ہی گناہ کا کام۔ خطرے کے تمام خطوط پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ وقار محسن کی یاد میں تحریر پڑھ کر آنکھیں نم ہوگئیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ (آمین) ہمیں اسی بات کی شکایت تھی کہ مرحوم اشتیاق احمد کے بارے میں کوئی تحریر نہیں تھی لیکن جنوری کے شمارہ میں پڑھ کر معلوم ہوا کہ اگلے ماہ مرحوم اشتیاق احمد کے بارے میں تحاریر شائع ہوں گی۔

ھانی عمران کا خط ہمارے سامنے ہے

۲۰۱۲ء کے بعد مصروفیات کے باعث ہم ساتھی سے ذرا دور ہو گئے تھے۔ فاصلے اتنے بڑھ جائیں گے ہمیں اندازہ ہی نہ تھا۔ آج دو، تین سال بعد جب ہماری خواہش پر بابا نے ساتھی رسالے لا کر دیئے تو ہم بہت خوش ہوئے اور خطرے میں لکھنے کا شوق ہوا، سوچا کہ اس خط کے ذریعے ساتھی سے ذرا قربت ہوگی۔ بڑے دنوں بعد ساتھی سے مل کر بہت اچھا لگا۔ اور پیارے ساتھیوں کی دلچسپ تحریریں پڑھ کر بہت مزا آیا۔ پہلے بھی ہم اک دفعہ خط لکھ چکے ہیں۔ جو ھانی عمران لکھتے ہیں کے ساتھ شروع ہوا تھا تو جناب ہم آپ کو بتاتے چلیں کہ ھانی عمران لکھتے نہیں لکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہم نے سند باد کی سیر بھی لکھی تھی جس پہ ہمیں بڑوں سے خوب داد ملی تھی۔ امید ہے ہمارے خط کو ردی کی نظر نہیں کریں گے۔

🙞......کچھ نام ایسے ہیں جو دھوکا دے جاتے ہیں۔ اچھا ہوا آپ نے بتا دیا آئندہ خیال رکھا جائے گا۔

بلال سہیل بھی رونق محفل ہیں

سال کا پہلا شمارہ اور اس کا خوبصورت سرورق مشاعرہ اور ساتھی رائٹرز ایوارڈ کی تقریب کی رپورٹ کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے تھے لیکن پھر بھی ہم نے رپورٹ پڑھ لی لیکن ہمیں اس میں صرف ایک بات سے اختلاف ہے کہ تقریب ساڑھے چار بجے شروع ہوئی۔ تقریب کافی لیٹ شروع ہوئی تھی۔ سرورق کے بعد اشتیاق احمد صاحب کے انتقال کی خبر۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ دل پہ دستک کیا عمدہ سبق ہے۔ بے شک قرآن ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ 'ہورہے گا کچھ نہ کچھ' سیما صدیقی کا نام بہت عرصے بعد نظر آیا۔ سبق بہترین تھا۔ 'شرارتی بھوت' کا آئیڈیا پرانا تھا۔ 'ایک انچ کی کلی' اور 'ستاروں والی لڑکی' بچوں کے لیے بہت اچھی کہانی تھی۔ 'آپ کی تخلیق' اس بار کافی اچھی رہی۔ خاص طور پر زاہدہ عروج کی 'آپ بھی کر سکتے ہیں' نے دل کو چھولیا۔ اس کے علاوہ 'رنگ برنگی تھیلیاں'، 'قصہ پانچ روپے کا' اور 'عیدی' اچھی لگیں۔

شکوے شکایات سے بھرا کومل فاطمہ اللہ بخش کا خط پیشِ خدمت ہے

سال نو کا پہلا شمارہ نہایت تاخیر سے ملا اور ابھی تک پورا شمارہ پڑھا بھی نہیں کیونکہ اس بار ہمارا مزاج تبصرہ کرنے کا تو بالکل بھی نہیں ہے۔ میں تو آپ سے نالاں ہوں کیونکہ آپ لوگ میرے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں۔ پہلے تو چند مہینوں سے کسی نامعلوم وجہ سے آپ میرا کوپن انعامی سلسلہ میں شامل ہی نہیں کر رہے ہیں لیکن میں پھر بھی بھیجتی ہوں اور دوسرا یہ کہ اس مہینے تو آپ نے میرا خط سرے سے شائع ہی نہیں کیا۔ مجھے معلوم ہے میری اردو اتنی پختہ نہیں ہے اوروں کے جیسی مگر خط کاٹ پیٹ کے شائع کردیتے ہیں اور مصوری بھی نہیں شائع کی، خیر وہ تو کسی دوسرے مہینے بھی شائع ہوجائے گا۔

......آپ کی اردو پختہ ہے اسی لیے پورا خط بغیر کانٹ چھانٹ کے شائع ہوا ہے۔ مصوری وقت آنے پر شائع ہوجائے گی۔

چلبلے سے محمد عمر بن عبدالرشید لکھتے ہیں

سب سے پہلے 'دل پہ دستک' اور 'السلام علیکم' پڑھا۔ 'ہورہے گا کچھ نہ کچھ' سیما صدیقی ایک لمبی غیر حاضری کے بعد مزے دار کہانی کے ساتھ حاضر ہوئیں۔ 'شیخ زید مسجد' نے معلومات میں مزید اضافہ کیا۔ 'نیلم پری کی نیند' ننھے شوقین کے لیے تھی لیکن پھر بھی اچھی لگی۔ 'سیرت لائبریری' معلوماتی مضمون تھا۔ 'ذرا کھلکھلائیے' اچھے لگے۔ 'ٹوتھ پیسٹ کا معما' ہائے اللہ ٹوتھ پیسٹ کھانے کا چسکا لیکن کہانی اچھی لگی۔ 'حمد رب جلیل' ضیاالحسن ضیا نے خوب حاضری دی۔ 'مچھر نے کاٹ کھایا' بہت احتیاط سے پڑھی کہ کہیں اوپر بنا مچھر ہمیں نہ کاٹ کھائے۔ دلچسپ وعجیب سچ میں دلچسپ وعجیب تھا۔ 'وہ فتح عالم تھا' زبردست نظم تھی۔ 'اردو زباں ہماری' اچھا سلسلہ ہے۔ 'سزا کی دعوت' پسند نہیں آئی۔ ساتھی مصوری میں تمام مصوریاں اچھی لگیں۔ 'ایک انچ کی کلی' نے اچھا سبق دیا۔ 'شاعر سب شرمائے تھے' اچھی بلکہ زبردست تھی۔ 'آپ کی نگارشات' ننھوں کا سلسلہ ہے۔ 'پانی کا سالانہ معلوماتی مضمون تھا۔ 'گاؤں کے رنگ نرالے' بھی کچھ کم نہیں تھی۔ شرارتی بھوت میں تو ہمیں اپنا عکس نظر آیا۔ ستارے والی لڑکی اچھی کہانی تھی۔ خطرے ذرا سا کھٹا تھا۔ آپ سے گزارش ہے کہ کوئی سلسلہ وار ناول شروع کریں، نیا انعامی سلسلہ شروع کریں اور اس بار خوفناک نمبر یا ماں نمبر شائع کریں اور رسالہ کے صفحات ۱۲۰ کردیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔

عروسہ ناز کا پہلا خط شائع ہورہا ہے، خوش آمدید کہتے ہیں......

یہ ساتھی رسالہ میں میرا پہلا خط ہے۔ ساتھی رسالہ مجھے بہت پسند آیا۔ اس میں بچوں بڑوں سب کے لیے کافی اچھا مواد موجود ہے۔ جنوری کے رسالہ میں 'ہورہے گا کچھ نہ کچھ' اور 'سزا کی دعوت' کہانیوں بہت پسند آئیں۔

حافظ رومیسہ اسحاق کا رنگ برنگا خط شامل اشاعت کرتے ہیں جسے آپ بلیک اینڈ وائٹ ہی پڑھیں گے......

ماہ جنوری کا ساتھی ہاتھوں میں ہے۔ سرورق پر شاعر صاحب کو دیکھ کر رائٹرز ایوارڈ کی تقریب کا خوبصورت منظر ایک بار پھر سے آنکھوں کے سامنے جلوہ افروز ہو گیا۔ ماشاء اللہ رائٹرز ایوارڈ تقریب کافی خوبصورت اور شاندار تھی۔ ہمیں یہاں شرکت اور بعد ازاں ایوارڈ ملنے کی جو خوشی ہوئی وہ ناقابل بیان ہے۔ شمارے میں تمام تحاریر، دلچسپ، زبردست اعلیٰ اور شگفتہ ہیں۔ مگر کچھ تحاریر قابل ذکر محسوس ہوتی ہیں۔ ان میں 'ٹوتھ پیسٹ کا معما' (انوشہ سروپ)، 'ایک انچ کی کلی' (رمشا جاوید) اور شرارتی بھوت (نورین احمد) اور 'ستارے والی لڑکی' (معروف احمد چشتی) ہیں۔ مزید یہ کہ دل پہ دستک ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اپنے اندر ایک بہت ہی گہرا اور عمدہ سبق سمائے ہوئے ہے۔ ساتھی کے ذریعے جس طرح ہمارے ساتھی بچوں کی آبیاری کر رہے ہیں وہ قابل تحسین ہے۔ السلام علیکم پڑھ کر اچھا لگا مگر ایک بات ہے۔ جو بار بار ذہن میں کھٹک رہی ہے۔ سوچا کیوں نہ ذکر کر ہی دیا جائے۔ وہ یہ کہ السلام علیکم میں آپ نے ۲۰۱۶ء یعنی نئے سال کے آغاز کا ذکر کیا مگر مسلمان ہونے کے ناتے جنوری تو ہمارے نئے سال کا آغاز نہیں ہے ناں......

......پاکستان میں بسنے والے تمام مسلمان نئے سال کا آغاز جنوری سے کرتے ہیں۔

سمیرا امیر کے خط کو شامل اشاعت کرتے ہیں

سرورق موسمی تھا سو اچھا لگا۔ لیکن افسوس ہم ووٹ ڈالنے سے قاصر ہیں۔ 'السلام علیکم' بھی نصیحت حاصل کرنے والوں کے لیے اچھا پیغام تھا۔ اس کے بعد خطوط کی دنیا میں جھانکا پے در پے پڑھتے جب ہم شارق عمران کے خط پر پہنچے تو افسوس سے ٹھنڈی آہ بھری کیونکہ انھوں نے لکھا ہے کہ رسالہ دیوار کے پار سے اُڑتا ہوا صحن میں آ گرا۔ اب یقیناً اخبارات اور رسائل میں اللہ اور اس کے رسول اور صحابہ کا نام ہوگا۔ اس میں قصور آپ کا نہیں ہے بلکہ آپ کو صرف ایک کام کرنا ہے وہ ہے ان انکل کو یہ بات سمجھانا، باقی ان کی مرضی ماننے یا نہ ماننے میں تو اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئی اب آگے آپ کا کام ہے۔ ویسے اس مرتبہ الیاس نواز نے پنگھی میں بیٹھے بغیر بھی اچھا خط لکھا۔ جبکہ خزیمہ سلیمان بڑے دن بعد آئے وہ بھی اچھلتے کودتے، ویسے ایک بات سمجھ دانی میں نہیں آتی کہ ساتھی کا ہر قاری اپنی عمر کا لحاظ کیے بغیر اچھلتا کودتا کیوں ہے؟ ماہم جاوید کو ماہم عدیل بننے پر بہت بہت مبارکباد۔ آپ کی تخلیق کی تمام تخلیقات ہی بہترین تھیں۔ 'پُراسرار قلعہ' 'جیومیٹری' اچھی لگی۔ اس بار اطہر ہاشمی انکل کا تبصرہ بے حد پسند آیا۔ مجھے عربی کی کچھ جانکاری (شدبد) ہے اس لیے مجھے ان کا تبصرہ پڑھنا، اچھا لگتا ہے۔ جبکہ آخر میں 'چچا ہادی نے ناول لکھا' پڑھی اور بے اختیار واہ واہ کی۔ اس کہانی سے مدیران کو سبق حاصل کرنا چاہیے کہ ایک مصنف کو کہانی شائع نہ ہونے پر کتنا دُکھ ہوتا ہے۔

......ہم اس دُکھ کی گھڑی میں چچا ہادی کو صبر کی تلقین کرتے ہیں۔

مصباح امیر اپنا تعارف کراتے ہوئے لکھتی ہیں

میں کلاس پنجم میں پڑھتی ہوں۔ میں نے آپ کو خط اس لیے لکھا ہے کیونکہ مجھے ساتھی رسالہ بہت پسند ہے۔ میں اسے بہت دلچسپی سے پڑھتی ہوں۔ اس میں بہت مزے مزے کی کہانیاں ہوتی ہیں جس سے ہمیں سبق حاصل ہوتا ہے۔

کومل بنت محمد فاضل اپنے پہلے خط میں لکھتی ہیں

سالنامہ بہت اچھا تھا۔ مجھے نیلم پری بہت پسند آئی۔ 'مچھر نے کاٹ کھایا' ارسلان اللہ خان کی نظم بہت اچھی لگی۔ 'سزا کی دعوت' بہترین تھی۔ 'حمد رب جلیل' اور 'ایک انچ کی کلی' بہترین کہانیاں تھیں۔ 'ستارے والی لڑکی' جو معروف احمد چشتی نے لکھی ہے بڑی شاندار کہانی ہے۔ مجھے ساتھی مصوری میں انس منیر احمد اور رافعہ عثمان کی ڈرائنگ بہت اچھی لگی۔ وہ 'فاتح عالم تھا' نعیم الدین نعیم نے ایک شاندار نظم لکھی ہے۔ 'شرارتی بھوت' نورین ایمان ایک زبردست تحریر تھی۔ 'ٹوتھ پیسٹ کا معما' ایک بہترین مضمون تھا۔ یہ میرا پہلا خط ہے امید ہے کہ شائع کریں گے۔

ارم بلوچ محمد رفیق کا خط آپ کے سامنے ہے

جنوری کے نئے شمارے کی سب سے پہلے السلام علیکم پڑھا۔ ان شاء اللہ آپ کی اس بات پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی۔ آخر غالب کی شاعری ہمارے سر کے اوپر سے گزر جاتی ہے۔ لیکن سیما صدیقی کی تحریر پڑھ کر ہمارے دماغ میں سما گئی۔ 'ہو رہے گا کچھ نہ کچھ' بہت ہی خوبصورت تحریر تھی۔ خاص کر یہ جملہ کہ "کیا ہم برے حالات و واقعات کو ڈیلیٹ کرنے کا اختیار رکھتے ہیں؟ اچھا اور برا وقت آتا اور جاتا رہتا ہے۔" 'سیرت لائبریری' کی روداد نے حیرت میں ڈال دیا۔ سندھ کے ایک چھوٹے سے شہر میں ایسی بڑی لائبریری کا قیام، یہ شہر شہداد کوٹ کون سے ضلع میں واقع ہے؟ جواب ضرور دیجیے گا۔ 'ٹوتھ پیسٹ کا معما' حل کرنا پڑ گیا۔ اس ماہ کی سب سے خاص چیز تھی بچوں کا کل پاکستان مشاعرہ اور ساتھی رائٹرز ایوارڈ کی تقریب کی تفصیلی رپورٹ۔ پڑھ کر اچھا بھی لگا اور شرکت نہ کرنے کا دکھ بھی ہوا۔ 'ایک انچ کی کلی' واقعی غرور کا سر نیچا۔ 'شرارتی بھوت' نے ہمارے نٹ کھٹ سے دماغ کو کہانی لکھنے کا آئیڈیا دے ڈالا۔ 'ستارے والی لڑکی' کے بارے میں پڑھ کر ہم نے بھی کچھ نیا کچھ انوکھا کرنے کی ٹھان لی۔ 'آپ کی تخلیق' میں سب کی تخلیقات پڑھیں تو بے اختیار اپنی کم علمی کا احساس ہوا۔ ایک سوال پوچھنا تھا کہ ساتھی مصوری کے لیے اسکیچز بھیج سکتے ہیں؟ اور ہاں اس بار میں مکمل پتا بھیج رہی ہوں۔

٭...... قمبر اور شہداد کوٹ دو بڑے شہر ہے جنھیں ملا کر ایک ضلع بنایا گیا ہے جسے قمبر شہداد کوٹ کہا جاتا ہے۔ شہداد کوٹ...... قمبر سے ۳۰ منٹ کے فاصلے پر موجود ہے۔

بنت محسن کا طویل خط ہمارے سامنے ہے جواب طویل نہیں ہے......

یہ وہ واحد خط ہے جسے لکھتے وقت سمجھ نہیں آ رہا کہ کس بات سے ابتدا کی جائے، کیا کیا بات کہی جائے اور کس بات کا ذکر رہنے دیا جائے الفاظ کو اپنی پکڑ میں رکھا جائے یا جیسے الفاظ کے بہاؤ کو ان کاغذ کے ٹکڑوں پر بہنے دیا جائے، اف خدایا! کس قدر الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں دماغ میں، جی میں کسی طوالت کا لحاظ کیے بغیر خط لکھے جا رہی ہوں، آپ لوگوں کو اس بے چارے خط کے ساتھ جتنی مار پیٹ کرنی ہے میری طرف سے بخوشی اجازت ہے۔ میری نظر میں جب تک میں بالکل چھوٹی تھی (چھوٹی تو میں اب بھی ہوں) میرے خط لکھنے کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ خط چھپے میرا نام بھی ساتھ لکھا ہو، خط کا جواب بھی تحریر ہو تو ذرا اور سجاوٹ ہو جائے اپنے خط کی۔ لیکن اب چاہے خط ساتھی میں چھپے نہ چھپے پورا خط ہو یا کاٹ پیٹ کے شائع کیا ہو۔ اس سب سے کوئی فرق نہیں پڑتا مجھے۔ اصل مقصد آپ تک داد پہنچانا ہوتا ہے۔ آپ کی محنت کی اور جن لکھاریوں نے کوشش کی ان کی حوصلہ افزائی بھی۔ تازہ شمارہ میرے سامنے ہے۔ اعلیٰ سرورق، ہمیشہ کی طرح بہترین تھا 'دل پہ دستک'، 'السلام علیکم' بھی ہمیشہ اچھا ہی ہوتا ہے مگر کبھی کبھی ایسے دل چھو لینے والے الفاظ ہوتے ہیں کہ کیا بتاؤں۔ 'ہو رہے گا کچھ نہ کچھ' بھی بہت اچھی کہانی تھی۔ 'عالم اسلام کی شاہ کار مسجد' بہت اچھا سلسلہ ہے۔ 'نیلم پری' بھی اچھی لگی اور 'سیرت لائبریری' پڑھ کر تو بہت اچھا لگا۔ لطیفوں سے تو اب مجھے کوئی شکایت ہی نہیں رہی اور اس شمارے میں تو بیچ بیچ میں موجود لطیفوں نے ساتھی پڑھنے کا مزا دوبالا کر دیا۔ 'مچھر نے کاٹ کھایا' سو فیصد صحیح نظم ہے 'ٹوتھ پیسٹ کا معما' کا نتیجہ اختتام سے پہلے اخذ کر لیا تھا لیکن کہانی بہت اچھی تھی۔ حمد باری تعالیٰ بے حد خوبصورت تھی۔ ظفر شمیم صاحب کا معلوماتی سلسلہ بہت اچھا ہے۔ 'جادوئی آب خورہ' پڑھ کر جب تک لغت میں لفظ 'آب خورہ' کا مطلب نہیں دیکھ لیا، چین نہیں آیا۔ 'مشاعرہ' کے بارے میں پڑھا تو شدت سے دل چاہا کہ کاش میں بھی وہاں ہوتی۔ 'وہ فاتح عالم تھا' بہت اچھی نظم تھی۔ اطہر ہاشمی صاحب کی تو کیا کہنے ہیں بس الفاظ ختم ہیں ان کے تبصرہ پر۔ 'شاعر سب شرمائے تھے' کیا اعلیٰ نظم تھی۔ 'آپ کی نگارشات' میں سب بہت اچھی تھیں۔ 'گاؤں کے رنگ نرالے' میں تو میں جیسے گاؤں کی سیر ہی کر کے آ گئی۔

☆......☆